دلِ زار
کلثوم اعظم

Writer's instagram id: @the_storyteller_ka

دور افق میں کہیں سورج ڈھلنے کے قریب ترین تھا۔ نیلگوں آسمان سرخ اور زرد رنگ کے امتزاج میں ڈھلا ہوا بے حد بھلا لگ رہا تھا۔ چرند پرند آسمانوں میں پرواز کیے اپنے گھروں کی طرف روانہ تھے۔ کوئل کی کوک سارے عالم میں گونجتی تھی۔ ایسے میں اسلام آباد کے اس علاقے میں اونچے، بڑے بنگلے میں بھی یہ وقت شام کا تھا۔ مکان کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے ہم ٹیرس پر آ جاتے ہیں۔ سیاہ رنگ کے پنچنگ بیگ کے سامنے کھڑا وہ اس پر مکے برسا رہا تھا۔ سیاہ کپڑوں میں ملبوس، ہلکے بڑے سیاہ بالوں میں وہ ایک ماہر کی طرح اپنے کام میں مصروف تھا۔ ساتھ اس کا بھتیجا کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ دونوں کے لب ہلتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ دونوں شاید آپس میں کوئی بات کر رہے تھے۔

چند ثانیے بعد اس کا بھتیجا اندر کہیں غائب ہو گیا تھا، وہ وہیں نیچے بیٹھ گیا، پھر چند گہری سانسیں لیں۔ جینز کی جیب سے رومال نکالا، پسینہ پونچھا اور دیوار سے سر ٹکائے آنکھیں بند

کیے بیٹھا رہا۔ دھیرے دھیرے کوئل کی آواز مدھم پڑتی گئی، اور آفتاب مکمل ڈوب گیا، سرخ اور زرد رنگ کا آسمان سیاہی میں ڈوبنے لگا تھا پھر مغرب کی اذان سارے میں گونجنے لگی۔

دو تین مساجد سے ساتھ آوازیں آرہی تھیں۔ جیسے سارے عالم میں بس اللہ اللہ کی پکار ہو رہی ہو۔ اُسے مغرب کا یہ پیارا منظر بہت بھاتا تھا۔ وہ وہیں بیٹھا رہا، آنکھیں بند کیے، ساتھ آہستہ آہستہ لب ہل رہے تھے۔ وہ شاید نہیں یقیناً مؤذن کے پیغام کا جواب دے رہا تھا۔ اندھیرا بڑھنے لگا، گلیوں میں موجود بلب روشن ہوئے۔ لوگوں نے بھی اپنے گھروں میں مصنوعی روشنیاں کرنا شروع کر دیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا، کپڑے جھاڑے اور اندر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ ٹیرس کا دروازہ بند کر دیا ورنہ مچھروں نے جینا حرام کر دینا تھا۔ ٹیرس کے ساتھ بنا کمرہ اس کا تھا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے کی طرف آیا۔

سفید رنگ کی دیواریں صاف و شفاف تھیں۔ کمرے میں کوئی ایک پینٹنگ بھی موجود نہ تھی۔ ایک طرف باتھ روم تھا۔ باتھ روم کی ساتھ والی دیوار میں سفید رنگ کی الماری پھر اس کے ساتھ والی دیوار میں کھڑکی۔ یہ کھڑکی پوری دیوار کو گھیرتی تھی۔ کمرے میں مزید کچھ نہ تھا۔ وہ سیدھا باتھ روم کی طرف گیا، چند منٹوں بعد وہ باہر آیا تو چہرہ گیلا تھا۔ وہ یقیناً وضو کر کے آیا تھا۔ کمرے میں موجود روشن بلب کو بجھایا اور زیرو کا بلب جلا دیا۔ وہ گہرے سبز رنگ کا بلب تھا۔ سارے میں سبز روشنی بکھر گئی۔ چند منٹ اسے سر خدا کے آگے جھکنے میں لگے پھر وہ کھڑکی کی طرف چلا آیا۔ سفید پردے ایک طرف کیے، پھر وہیں ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ ساتھ آہستہ آہستہ زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا۔ انگلیاں بھی حرکت میں تھیں۔ چونکہ اس کا کمرہ دوسری منزل پر تھا تو اس کھڑکی سے سامنے بنے بنگلے، دونوں اطراف میں موجود شاہراہ اور نیچے گلی سب کچھ نظر آتا تھا۔ وہ یونہی دیکھے گیا، دیکھے گیا۔ جیسے ہی تسبیح ختم ہوئی وہ چونکا۔ اسے پہلے یہ خیال

کیوں نہ آیا تھا۔ یہ سب سے بہترین تھا۔ گہری سانس لے کر وہ ڈریسر پہ رکھے اپنے موبائل کی طرف بڑھ گیا۔ اسلام آباد میں رات نے اپنے پر پوری طرح پھیلا دیئے تھے۔

☆......☆......☆

اگلی صبح انتہائی خوشگوار ہوئی تھی۔ ستمبر کا وسط تھا جہاں وہاں اسلام آباد میں موسم قدرے بہتر تھا۔ دس بجے اس کی آنکھ کھلی تو وہ فریش ہو کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ رات وہ جلد سو گیا تھا۔ پھر تہجد کے وقت اٹھنے کے بعد سے وہ صبح ہلکی ہلکی روشنی میں دوبارہ سویا تھا۔ اب جب وہ اٹھا تو موسم کی طرح اس کا موڈ بھی خوشگوار تھا۔ زینے اتر کر نیچے آیا تو دیکھا سارے گھر میں خاموشی کا راج ہے۔

وہ باورچی خانے میں چلا آیا۔ بھورے رنگ کی ڈھیلی ڈھالی سی شرٹ کے ساتھ سیاہ رنگ کا ٹراؤزر پہنے، تھوڑے بڑے سیاہ بال اس پہ اچھے لگ رہے تھے۔ کریم رنگ کی دیواروں والے باورچی خانے میں ہر چیز ترتیب سے رکھی تھی۔ وہ چولہے کی طرف چلا آیا۔ چولہے پر پتیلی رکھی، پھر ایک کپ پانی کا ڈالا اور اوپر والا دراز کھولا۔ دراز سارے سیاہ رنگ کے تھے۔ وہاں مختلف قسم کے ڈبے رکھے تھے۔ اس نے پہچان کر سفید رنگ کے دو ڈبے نکالے۔ ایک بڑا تھا قدرے تو دوسرا چھوٹا جس کے ڈھکن سرخ رنگ کے تھے۔ بڑے والے ڈبے سے کھانے کے چمچ سے چینی نکالی اور پتیلی میں ڈال دی، پھر دو چمچ پتی کے بھی، پھر سے چیزیں اپنی جگہ پر رکھتے دراز بند کیں۔ اب وہ فریج کی طرف آیا۔ پاؤں سیاہ رنگ کے چپل میں مقید تھے۔ اس نے فریج کھولا تو ایک بڑے سے سٹیل کے ڈبے میں دودھ رکھا نظر آیا۔ وہ اسے باہر نکال لایا پھر سفید رنگ کے کپ میں انڈیلا۔ کپ سے چولہے پہ رکھی پتیلی میں۔ آخر میں آٹو میٹک چولہا آن کر دیا۔ بنا کوئی پھیلاؤ کیے اگلے چند منٹوں میں وہ چائے بنا چکا تھا۔ تیز دودھ

اور پتی اور بالکل وافر مقدار میں چینی والی چائے اس کی پسندیدہ تھی۔ چائے لیے وہ وہیں کچن میں رکھے ڈائننگ کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ساتھ کچھ سوچ بھی رہا تھا۔ گھونٹ گھونٹ لیتے وہ چونکا۔ باہر سے ماما آ رہی تھیں۔ وہ بے اختیار مسکرایا۔ وہ بھی آگے بڑھ آئیں۔

''تمہارا میسج ملا تھا۔ آفس سے کیوں چھٹی لی ہے کہیں جا رہے ہو؟'' انہوں نے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔ پتیلی اور چائے چھاننی صاف ستھری پر گیلی تھیں۔ باقی ہر چیز اپنی جگہ پر موجود اور صاف ستھری تھی۔ ان کی اس اولاد میں الگ سا سلیقہ تھا۔ بچپن میں سکھائے گئے طور طریقے سے بڑے بیٹے نے تو مصروفیت کی بنا پر یا پھر بڑے ہونے کی بنا پر چھٹکارا حاصل کر لیا تھا لیکن یہ چھوٹا بیٹا جیسے بچپن میں ہی کہیں رہ گیا تھا۔

''نہیں۔ بس یوں ہی تھک سا گیا ہوں ہر چیز سے، تھوڑے دن آرام چاہتا ہوں۔'' وہ چائے پی چکا تھا۔ ماما دروازے میں ہی کھڑی تھیں۔

''آگے لے لینا تب آرام بھی کر لینا۔'' ماما نے مشورہ دیا۔ وہ ان کے فربہ پر خوبصورت چہرے کو دیکھ کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا وہ کیوں کہہ رہی ہیں ایسا۔

''ماما! ایک ہفتے کی چھٹیاں لی ہیں، وہ بھی بہت مشکلوں سے۔ کیونکہ میں اب تھکا ہوا تھا دماغی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی۔ اور انسان تب ہی آرام کرتا ہے جب اسے ضرورت محسوس ہو۔'' اس نے نرمی سے کہا، پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ ماما نے ہاتھ آگے بڑھایا بھی پر وہ نفی میں سر ہلاتا سنک کی طرف چلا آیا۔

''تو کون کہتا ہے ان کمپنیوں میں خوار ہونے کو۔ اپنے باپ کا بزنس ہے۔ اسحاق باپ کا ساتھ دے رہا ہے۔ ان کا بزنس میں ہاتھ بٹا رہا ہے۔ آسیہ (اسحاق کی بیوی) نے بھی شوہر اور سسر کا کام بانٹ دیا ہے تم جانے کے لیے کیوں اپنی ضد پر اڑے ہو۔'' ماما نے کافی خفگی سے

کہا تھا۔ وہ ہمیشہ والی بات دہرا رہی تھیں جو اس گھر میں وقتاً فوقتاً سب اس سے کہتے تھے۔

''میں ضد نہیں کرتا ماما۔'' اس نے مصنوعی ناراضگی سے کہا تو ماما ہنس پڑیں۔ اسے ایک یہی بات قابل اعتراض لگی تھی۔

''جانے تم جیسے معصوم لڑکے دنیا میں موجود بھی ہیں یا نہیں عیسیٰ...... کیا چیز ہو تم۔ لگتا ہی نہیں ہے اکیسویں صدی کے ہو۔'' انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ اب وہ باہر جا رہی تھیں۔ عیسیٰ ان کے پیچھے تھا۔

''مجھے سادہ زندگی پسند ہے ماما۔ نہ لڑائی نہ جھگڑے، نہ ہی بے پناہ دولت۔ صبح نو سے پانچ کی نوکری، نماز، قرآن اور خاندان۔ مجھے ہر اس چیز سے اکتاہٹ ہوتی ہے جو آج کل کی نسل کے لیے لازم وملزوم ہے۔ اور پھر میرے جیسے انسان دنیا میں شاید کم ہوں لیکن ہوتے ضرور ہوں گے۔'' وہ کہتے ساتھ زینے چڑھنے لگا۔ ماما نیچے ہی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

☆......☆......☆

دھوپ باسی ہوئی تو شام نے اپنے پَر پھیلائے۔ وہ اسی حلیے میں مغرب سے ذرا پہلے ایوب نیشنل پارک کے باہر کھڑا تھا۔ بائیک پارکنگ میں پارک کر کے وہ آگے بڑھ آیا۔ مغرب میں ابھی وقت تھا۔ وہ پارک کے اس حصے میں آیا جہاں باغ تھا۔ جگہ جگہ بینچ رکھے گئے تھے، ساتھ درخت تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے دنیا میں ہی جنت ہو۔ ایوب پارک اتنا بڑا تھا کہ جو پہلی دفعہ وہاں جاتا پھر اسے باہر کا راستہ ڈھونڈنے میں عرصہ لگ جاتا۔ وہ خاموشی سے ایک طرف آ کر نیچے گھاس پر بیٹھ گیا۔ اس حصے میں لوگوں کی آمد و رفت کم تھی۔ اکا دکا لوگ، یا پھر چند جوڑے واک کرتے یا بیٹھے نظر آتے تھے۔ چونکہ مغرب کا وقت تھا ہر طرف چڑیوں کی چہچہاہٹ سنائی دیتی تھی۔ شام کا مغرب سے ذرا پہلے کا وقت اور صبح فجر کے بعد ہلکی ہلکی روشنی

والا وقت عیسیٰ زبیر کے پسندیدہ وقتوں میں سے تھے۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ، سوندھی سوندھی خوشبو اور گہری خاموشی، نہ انسانوں کی آوازیں اور نہ ہی ذرائع مواصلات کا شور۔ ایسے جیسے دنیا کہیں کسی قدیم زمانے میں چلی آئی ہو۔ دن میں بارش ہوئی تھی تو گھاس نم سی تھی۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں پہنی سلور رنگ کی گھڑی میں وقت دیکھا، نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ وضو اس نے گھر سے کر رکھا تھا۔ پھر جہاں بیٹھا تھا وہیں سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹے سے سرو کے درخت کے پیچھے نماز کے لیے نیت باندھے کھڑا ہو گیا۔ وہ اس پارک میں اتنی بار آ چکا تھا اسے اندازہ تھا قبلے کا۔

عیسیٰ زبیر کی نماز نہ بہت آہستہ ہوتی تھی نہ بہت عجلت بھری۔ وہ اردگرد سے بیگانہ نماز پڑھتا تھا۔ ہلکے ہلکے لب ہلائے، وہ جیسے رب سے محو گفتگو ہوتا تھا، جہاں کسی دوسرے کا گزر نہ تھا۔ سیاہ بال ہلکے ہلکے ہوا کے ساتھ جھوم رہے تھے۔ اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا پر وہ اسی طرح نماز پڑھے گیا۔ تین فرض پھر دو سنت اور پھر دو نفل اور پھر مزید دو نفل۔ شکرانے کے؟ معافی کے؟ حاجت کے؟ یہ کوئی نہ جانے۔ پھر چند منٹ بیٹھ کر تسبیح کرنے کے بعد وہیں بیٹھے موبائل کی ٹارچ جلادی۔

''میرا وضو نہیں تھا ورنہ میں بھی نماز پڑھ لیتا۔'' اس نے چہرہ گھما کے دیکھا، وہاں ایک ادھیڑ عمر انسان نظر آیا۔ انہوں نے بھی اپنے فون کی ٹارچ آن کر رکھی تھی۔ پارک کا یہ حصہ قدرے اندھیرے میں تھا۔ وہ وہیں اس کے قریب بیٹھ گئے ایک ہاتھ میں شاپر تھا اور دوسرے ہاتھ میں موبائل۔ سمارٹ فون کو دیکھ کر اسے زیادہ حیرت نہ ہوئی۔ آج کل چھوٹے، بڑے، بزرگ ہر کسی کے ہاتھ میں سمارٹ فون ایک عام سی بات تھی۔ عیسیٰ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ بہت کم گو تھا حد سے زیادہ۔ سوائے اپنے گھر والوں کے اور چند ایک دوستوں کے وہ

کسی سے بات چیت نہ کرتا تھا زیادہ۔

''تم کافی دیر دعا مانگتے رہے؟'' انہوں نے پوچھا تو وہ ہلکے سے مسکرا دیا۔ اسے یہ ڈر لاحق نہ تھا کہ اس کے آنسو کسی اور نے دیکھ لیے ہوں گے۔ وہ بچوں کی طرح دونوں ہاتھوں کو دعا کی صورت باندھے پورا چہرہ چھپائے دعا کرتا تھا۔

''دعائیں یقین کے ساتھ ساتھ تسلسل بھی مانگتی ہیں۔'' پھر دھیمے سے کہا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میرا نام گل شاد حسین ہے۔ فوج سے ریٹائر ہوا ہوں۔ آج کل ریٹائرمنٹ کا پیسہ اڑا رہا ہوں اور تم؟'' وہ سیاہ شلوار قمیض میں ملبوس تھے۔ فون کی ٹارچ میں اس نے ان کا چہرہ دیکھا۔ سفید بے داغ چہرہ، سرخ رنگ کی مونچھیں جو گھنی نہ تھیں، بھوری آنکھیں جن کی پلکیں دراز تھیں، اور سرخ بال، جانے رنگ تھا یا واقعی بال ایسے تھے، اس نے سوچا۔ پھر نظریں ان کے ہاتھ کی طرف گئیں جو اس کے آگے تھا۔ اس میں برگر تھا۔

''نہیں، میں ویسے بھی جا رہا تھا خود لے لوں گا۔'' اس نے منع کیا۔ فون اب گھاس پر الٹا پڑا تھا۔ روشنی سیدھا اوپر جا رہی تھی پر ارد گرد بھی پھیلی تھی۔ پارک میں ہنوز شور تھا پر یہاں شور قدرے کم آتا تھا۔

''لے لو، میں ویسے بھی اکیلا ہوں پر برگر دو لایا ہوں۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی مل جاتا ہے جس کے ساتھ مل کر کھاتا ہوں۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مسکرانے سے ان کی ٹھوڑی پر گڑھا گہرا ہوتا تھا۔ عیسیٰ نے خاموشی سے برگر لے لیا اور کھانے لگا۔ اس نے سوچا پوچھے آپ روز پارک آتے ہیں کیا، گھر قریب ہے؟ لیکن وہ بہت کم گو تھا اتنی لمبی بات کسی اجنبی سے کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے گل شاد حسین کو دیکھا وہ اپنے موبائل پر

لگے تھے۔ برگر دائیں ہاتھ میں اسی طرح موجود تھا، جیسے عموماً آج کل کی نسل کوئی چیز کھانے پینے سے پہلے ٹی وی یا موبائل پر کچھ دیکھنے کے لیے لگاتی ہے اور کھانا پاس پڑا انتظار کر رہا ہوتا۔ گل شاد حسین بھی شاید یہی کر رہے تھے۔ اسے ہنسی آئی جسے وہ برگر منہ میں لیتے چھپا گیا۔ لیکن چند لمحے بعد کسی کے کھنکارنے کی آواز نے بے اختیار اسے رخ موڑنے پر مجبور کیا۔ پہلے نیچے رکھے موبائل کو دیکھا جو ابھی ابھی نیچے رکھا گیا تھا جس پر محی الدین غزل کی تیاری میں مصروف تھے۔ پھر گل شاد حسین کو دیکھا انہوں نے بھی اسے دیکھا۔

''یہ شاعر لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ مختصر لفظوں میں ہماری طویل داستانِ حیات اور وسیع قصہ دل کہہ دیتے ہیں۔'' انہوں نے کہا۔ مسکراتے ہوئے پر ان کی آنکھوں میں عیسیٰ نے کچھ دیکھا۔ وہ کیا چیز تھی؟ دکھ، پچھتاوا، تکلیف کرب یا پھر اذیت یا انتظار؟ اسے سمجھ نہ آیا۔ غزل شروع ہو چکی تھی۔

''پھر کوئی آیا دلِ زار؟ نہیں کوئی نہیں
راہرو ہو گا، کہیں اور چلا جائے گا''

پارک میں موجود لوگوں کی آوازیں اب کہیں دور سے سنائی دیتی تھیں۔ برگر منہ میں چباتے عیسیٰ کو لگا دلِ زار میں بے انتہا اذیت پہنچی ہے۔ یہ فیض کی غزل تھی اسے یاد تھا۔ وہ اردو ادب کا کچھ خاص شوقین تو نہ تھا پر تھوڑا بہت جانتا تھا۔ شاعروں کو، ادیبوں کو، مصنفوں کو اور مصوروں کو۔

''ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ''

بے اختیار اس کی نظریں آسمان کی جانب اٹھیں۔ چاند کہیں نہ تھا پر تارے نیلے آسمان

میں جگمگ کرتے نظر آرہے تھے۔ ہر سو جیسے کسی نے موتی گرا دیئے ہوں۔ سفید ننھے ننھے موتی جو بعض بہت چمک رہے تھے بعض کی جگمگاہٹ تھوڑی کم تھی۔ دفعتاً روشنی مدھم پڑی تو اس نے گھاس پر پڑے موبائل کو دیکھا۔ وہ کوئی تتلی تھی جو بھول بھٹک کر دھوپ کے دھوکے میں اس کی موبائل کی روشنی کی طرف چلی آئی تھی۔ اس نے بے اختیار اسے پکڑنا چاہا۔ پر وہ خطرہ محسوس کرتے بھاگ گئی۔ گل شاد حسین نے خاموشی سے اس کی حرکت دیکھی، لیکن کہا کچھ نہیں۔ وہ جیسے ذہنی طور پہ کہیں اور غائب تھے۔ کہیں دور، ماضی کے کسی لمحے میں۔

"سو گئی راستہ تک تک کے ہر ایک راہ گزر
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سرا"

وہ پھر سے برگر کھانے میں مصروف ہو چکا تھا۔ اجنبی خاک کیا ہوتی ہے اس نے سوچا؟ شاید کوئی نئی جگہ؟ یا پھر دل کے نہاں خانے میں کوئی نئی تکلیف۔ پر یہ تکلیف تو پرانی تھی۔

"گل کرو شمعیں، بڑھاؤ مئے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو"

وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ چھوٹے چھوٹے موتیوں جیسے دانت نظر آئے۔ چھوٹی مگر تیکھی ناک نے بھی ساتھ دیا۔ آنکھوں اور ہونٹوں کے گرد لائینز پڑیں۔ وہ ہنستا اچھا لگتا تھا۔ گل شاد حسین بھی جیسے چونک پڑے۔ پھر اسے دیکھا۔ آنکھوں میں یوں ہنسنے کی وجہ پوچھنے کا تاثر تھا۔

"کیا محبت نہ ملنے پر ہر انسان نمازی یا دیوانہ بن جاتا ہے؟" مسکراہٹ ہنوز چہرے پر موجود تھی۔ وہ اپنا برگر ختم کر چکا تھا۔ ہاتھ میں پانی کی بوتل موجود تھی جس میں سے اس نے چند لمحے پہلے گھونٹ لیے تھے۔

"محبت تغیر کا نام ہے۔ یہ حاصل بھی انسان کو بدل دیتی ہے یہ لاحاصل بھی انسان کو پہلے جیسا نہیں رہنے دیتی۔ ہاں پر اگر محبت ہو تو۔" انہوں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر رخ موڑ دیا۔ وہ اب اپنا برگر کھا رہے تھے۔ لیکن رخ موڑنے سے پہلے عیسیٰ نے ان کی آنکھوں میں دیکھا، وہاں کیا تھا؟ خالی پن۔ ان آنکھوں میں کچھ نہ تھا وہ آنکھیں کسی بھی تاثر سے پاک تھیں۔

"اب یہاں کوئی نہیں آئے گا، کوئی نہیں آئے گا۔"

محی الدین بار بار آخری مصرعہ دہرا رہے تھے۔ پر عیسیٰ کی سماعتوں میں کسی اور کی آواز بھی گونجی۔ اس نے چونک کر گل شاد حسین کو کو دیکھا۔ وہ دھیمے دھیمے بڑبڑا رہے تھے۔ برگر ہاتھ میں تھا، نظریں محی الدین پر اور دماغ؟ اس کا نہیں پتا وہ کہاں تھا۔

☆......☆......☆

شام کے سائے لمبے ہو کر رات میں ڈھل چکے تھے۔ کمرے میں بیڈ پر بیٹھی وہ سوپ کے باؤل میں سے چمچ بھرتی پھر بیڈ سے ٹیک لگائے اپنی ماں کی طرف بڑھاتی جسے وہ برے منہ کے ساتھ اپنے اندر اتارتیں۔ اور وہ اپنی چار آنکھوں سے (دو مصنوعی اور دو قدرتی آنکھوں) انہیں گھورتی تو آگے سے ایسی ہی گھورتی ہوئی نظریں واپس پا کر مسکرا دیتی۔

"اب ایک اور چمچ مزید نہیں ورنہ میں نے یہیں قے کرنی ہے۔" نقاہت بھری آواز میں تنبیہ تھی۔ دبلی پتلی سی وہ خاتون مزید کمزور لگنے لگی تھیں۔

"امی! بس ذرا سا باقی رہ گیا ہے۔" اس نے باؤل آگے کر کے دکھایا۔ کمرے میں اے سی لگا تھا۔ سفید رنگ سے دیواریں رنگی تھیں۔ بیڈ کے سوا کمرے میں صوفہ سیٹ اور لوہے کی الماری بھی رکھی گئی تھی۔ ساتھ ایک طرف باتھ روم تھا۔

''السا نور! میں اتنی کمزور بھی نہیں ہوئی کہ میرا ہاتھ میری چپل تک نہ پہنچے۔'' انہوں نے اسے گھورا تو وہ خفگی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر باہر کی طرف بڑھ گئی۔ چند منٹوں بعد اس کی واپسی دودھ کے پیالے کے ساتھ ہوئی۔ دراز سے بڑا سا سوہن حلوے کا ڈبا نکالا۔

''ایک تو یہ گولیاں کھا کھا کر میں نے مر جانا ہے۔'' انہوں نے ناگواری سے کہا۔

''مت کیا کریں ایسی باتیں۔'' وہ مصروف سی ڈھکن کھول رہی تھی۔ سوہن حلوے کے ڈبے میں اماں کی گولیاں پڑی تھیں۔ پھر ایک ایک کر کے گولی دیتی گئی جسے انہوں نے پانی کے ساتھ نگلا، آخر میں دودھ پیا۔ اُف، دودھ ذرا پسند نہیں تھا انہیں۔

''انس آ گیا؟'' انہوں نے پوچھا۔ وہ سال دوم میں تھا۔ اکیڈمی جاتا تھا تو نو بجے تک اس کی واپسی ہوتی تھی۔

''امی! ابھی سات بجے ہیں۔ اب آپ آرام کریں۔'' کہتے ساتھ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بلب بجھا کر اے سی بند کر کے پنکھا لگا کے وہ باہر نکل آئی۔ اس کا ارادہ اپنے کمرے کی طرف جانے کا تھا۔ کھانا اس نے انس کے ساتھ کھانا تھا۔ وہ دو بہن بھائی ہی تھے۔ انس اور السا نور۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے بتی جلائی۔ یہ کمرہ بھی سفید دیواروں والا تھا۔ ایک لوہے کا بیڈ رکھا تھا جس کے پیچھے دیوار پر تتلیوں والی گھڑی لگی تھی۔ بیڈ کے بالکل سامنے والی دیوار میں الماری تھی جس پر شیشہ لگا تھا۔ بائیں جانب والی دیوار میں کھڑکی تھی جبکہ دائیں جانب والی دیوار میں باہر کا دروازہ اور واش روم کا دروازہ دونوں تھے۔ وہ بیڈ کے ساتھ رکھے سائیڈ ٹیبل کی طرف آئی۔ وہاں رکھا فون یوں ہی پڑا تھا۔ اس نے سکرین روشن کی، دنیا جہاں کے پیغامات تھے۔ پر اسے ان پیغامات میں سے کوئی سروکار نہ تھا فی الحال۔ وہ وہیں بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھ گئی۔ بیڈ پر پڑا ''راجہ گدھ'' ناول اب اس کے ہاتھ میں تھا۔ بالکل عام سے نین

نقوش، سیاہ بال جو کمر تک آتے تھے، سیاہ آنکھیں جو چھوٹی تھیں چشموں کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں۔ وہ بھی اپنی اماں کی طرح تھی۔ دبلی پتلی پر دراز قد۔ وہ چوبیس سال کی تھی۔ اس نے ایک بار پھر موبائل کی طرف دیکھا جو ہنوز بند تھا۔ جانے اسے کب تک یوں انتظار کرنا تھا۔ یہ انتظار بیکار تھا۔ ازل سے تھا پر اب اسے عادت پڑ چکی تھی۔ انتظار تو لمبا ہوتا ہے بہت لمبا۔ آخر دو سال ہو گئے تھے۔ اس نے ناول رکھ دیا۔ اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ جس پر اب مہندی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ چہرے پر تھکاوٹ تھی۔

''کیا ہم کچھ عرصہ اپنے اور آپ کے رشتے کو وقت دے سکتے ہیں؟'' اس نے تب سوچا تھا۔ دو سال کیا کم وقت ہوتا ہے پر بنا منہ سے کچھ کہے اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ وہ بہت دھیما مگر خوبصورت بولتا تھا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر موبائل کی طرف دیکھا۔ وہاں کسی پیغام کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ وہاں تو کبھی کوئی پیغام آیا ہی نہ تھا۔ وہ تو ہمیشہ انتظار میں ہی مصروف رہی تھی۔ بہت سے پیغامات تھے لیکن اسے جس پیغام کا انتظار تھا بس وہ نہ تھا۔ گہری سانس لے کر ایک بار پھر وہ ناول اٹھا چکی تھی۔ ناولز ایسی دنیا ہوتی ہے جہاں دنیا نہیں ہوتی۔

☆......☆......☆

چند لمحوں بعد عیسیٰ نے سوچا، اب اسے گھر چلنا چاہیے۔ ایوب پارک سے PWD housingsociety پہنچنے میں اسے کافی وقت لگنا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' گل شاد حسین نے اسے اپنی سوچ سے باہر نکالا۔

''عیسیٰ زبیر۔'' اس نے بتایا۔

''خوبصورت نام۔ کیا تم نے کبھی محبت کی ہے عیسیٰ؟'' گل شاد حسین نے اس کی طرف

دیکھ کر پوچھا۔ وہ خاموشی سے انہیں دیکھے گیا۔

''ظاہر ہے اپنے خاندان سے محبت کی ہے۔'' پھر کہا۔

''اونہوں، میں محبوب اور عاشق والی محبت کی بات کر رہا ہوں۔'' بدمزہ ہو کر انہوں نے جتلایا۔

''میں نکاح سے پہلے والی محبت پر یقین نہیں رکھتا جناب۔'' اس نے اسی نرم لہجے میں کہا۔

''تو تمہیں کیا لگتا ہے واقعی محبت نہیں ہوتی؟'' انہوں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''اونہوں۔ محبت ہوتی ہے پر یوں نہیں ہوتی۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو ثابت کرو؟'' انہوں اس بار ایسے کہا جیسے کوئی مقابلہ ہو۔

''ثبوت کے طور پہ آپ عیسیٰ زبیر کو دیکھ لیں۔ عیسیٰ زبیر جیتا جاگتا ثبوت ہے، نکاح سے پہلے محبت کے منکر کو۔'' اس نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا۔ فخر نہیں تھا لہجے میں نہ تکبر لیکن کچھ تو تھا؟ شاید شکر گزاری؟

''اگر میں آپ کو کہوں کہ گل شاد حسین صاحب آپ ثابت کریں محبت کو کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود تو؟'' اب وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔ اس کا یہ رویہ دوستوں اور گھر والوں کے لیے مخصوص تھا لیکن کچھ فاصلے پر بیٹھے اس شخص میں جانے کیا خاصیت تھی۔

''ثبوت تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔ یعنی میں گل شاد حسین اور گواہ کشمیر کے پہاڑ ہیں۔'' انہوں نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔

''میں تمہیں اپنی داستان حیات سناؤں تب بھی یقین نہیں کرو گے؟'' اس بار گل شاد حسین نے چہرے کا رخ آسمان کی جانب موڑ دیا۔

ہاتھ دل پر تھا۔ ''دلِ زار'' وہ بڑبڑائے۔ عیسیٰ نے کچھ نہ کہا، وہ خاموشی سے انہیں دیکھے

گیا، لیکن گل شاد حسین نے سوال نہیں کیا تھا جس کے جواب کا وہ انتظار کرتے۔ وہ اب ایوب نیشنل پارک کے اس سیاہ حصے میں نہیں تھے۔ گل شاد حسین اپنی حیات کا معائنہ کرنے ماضی کی طرف نکل چکے تھے البتہ آج ان کے اس سفر میں عیسیٰ زبیر بھی ان کے ساتھ تھا۔

☆......☆......☆

ذہن بیدار ہوا تو آنکھیں بمشکل وا کرتے ہوئے چند لمحے وہ چھت کو تکتا رہا۔ نگاہیں کسی بھی احساس سے عاری تھیں۔ پھر جیسے لمحہ لمحہ ذہن میں بہت سی اشکال بننے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے ہر چیز یاد آ گئی۔ وہ پھر بھی چت لیٹا لکڑی کے بنے اس چھت کو دیکھتا رہا۔ پھر نظروں کا رخ موڑ کر کھڑکی کی جانب کر دیا۔ کھڑکی کھلی تھی باہر ہرے بھرے درخت نظر آتے تھے۔ دور دوسرے پہاڑ پر بنے گھر بھی دکھائی دیتے تھے۔ وہ مسکرایا اور اٹھ بیٹھا۔ سفر نے اسے کچھ ایسا تھکایا تھا کہ وہ آتے ہی سب سے ملتے ساتھ سو گیا تھا۔ پھر ایک انگڑائی لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ لکڑی کے بیڈ سے نیچے زمین پر قدم رکھا۔ ٹھنڈے پاؤں کو زمین نے چھوا تو جسم میں خوشگواریت دوڑ گئی۔ وہ چلتا ہوا آیا اور کھڑکی کی جانب چل دیا۔ ساتھ والے گھر میں خوب رونق لگی تھی۔ بھانت بھانت کی بولیاں اسے سنائی دیں۔ ابھی وہ باہر کے نظارے کر ہی رہا تھا جب دروازہ کھلا۔

''ہاں بھئی فوجی! کر لی نیند پوری؟ تم تو لگتا تھا بھنگ پی کر سوئے ہو۔'' شہریار نے کمرے میں آتے ساتھ کہا تھا۔ شلوار قمیض میں ملبوس اچھی شکل و صورت والا وہ اس کے چاچا کا بیٹا تھا۔ اس نے رخ موڑ کے دروازے کی سمت دیکھا۔ وہاں تین چار اسی کے ہم عمر نفوس کھڑے تھے۔

''بس یار کل ڈیوٹی سے آتے ساتھ ہی کشمیر کے لیے نکل پڑا تو سفر میں بھی نہ سو پایا۔ یہاں

جو آنکھ لگی پھر دیر تک سوتا رہا۔ کشمیر کے خوبصورت اور دلفریب موسم میں نیند بڑی گہری اور پُر سکون آتی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ساتھ دروازے کی سمت بڑھا۔

''ناشتہ کرلو پھر گاؤں کا چکر لگا آتے ہیں۔ شام کو تو مہندی کی رسم ہے۔'' یہ اس کا دوسرا چاچازاد تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

گھنٹے بعد وہ گاؤں کی کچی سڑک پر تھے۔ گاؤں گھومتے انہیں کچھ وقت تو ہو ہی گیا تھا۔ محلے کے چند لڑکے اور بھی تھے ان کے ساتھ۔

''ہاں بھئی تمہارا کیا ارادہ ہے شادی کا فوجی۔ ہم سب تو اس پھل کو چکھ چکے۔'' کسی ایک نے پوچھا تو سیاہ شرٹ پہنے وہ مسکرایا۔ ٹھوڑی کا گڑھا ساتھ مسکرایا۔ گہرے نیلے رنگ کی جینز کے پائنچے ذرا اوپر کو تہہ کر رکھے تھے۔ وجہ صبح ہونے والی بارش تھی۔ اس کے بعد یہ گھاس گیلی گیلی تھی۔ دور دور تک ہریالی تھی۔ چونکہ بہار کا موسم اختتام پذیر تھا، ہری گھاس اور ہرے پتے خوب پھل پھول چکے تھے۔ پہاڑ سر سبز اور خوبصورت لگتے تھے۔

''ایسی بھی کیا جلدی ہے جب کوئی ملا ہم سا، ہم بھی اس دنیا میں قدم رکھ لیں گے۔'' وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ باقی سب بھی مسکرا اٹھے۔

''اور جو مل گئی ہیں؟'' یہ اس کا وہی چچا زاد تھا۔ سب نے سن کہ قہقہہ لگایا۔ وہ شرمندہ ہونے کے بجائے خود بھی قہقہہ لگا گیا۔

''من چلے لوگ ہیں، دل کو بہلا لیتے ہیں ان سے۔ لیکن دل کو بھائے جو، ایسا کوئی موجود کہاں؟'' قدم روک کر اس نے کہا۔ ساتھ جیب سے سگریٹ نکالی کہ یکدم اس کے کانوں میں کھلکھلاہٹ پڑی۔

ویسے ہی نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ وہ چھاؤں میں کھڑا تھا۔ آواز دھوپ سے آئی تھی۔

مٹکے پکڑے وہ لڑکیوں کی ٹولی تھی، جو جانے کس بات پر ہنس رہی تھیں۔ سب کے چہرے دوسری سمت تھے۔ وہ وہیں رُک گئے۔

''لڑکیاں پانی لانے جا رہی ہیں اب گھر چلتے ہیں واپس، اس طرف تو نہیں جا سکتے۔'' یہ عمر میں ان سب سے بڑا پھوپھی زاد تھا۔ لڑکوں نے رخ موڑ دیا۔ تھوڑا دور گئے کہ اس کے فون پر کال آنے گی۔ وہ بٹنوں والا فون تھا۔ اس دور میں سمارٹ فون کہاں۔ وہ انہیں آگے بڑھنے کا کہہ کر خود رک گیا۔ وہیں نیچے پتھر پر بیٹھے ہوئے، وہ فون میں آئی کال پر مصروف تھا۔ اس کے ایک دو کزن بھی تھوڑا فاصلے پر رک گئے۔ سورج اب جیسے سر پر تھا۔ بات کرتے کرتے اس نے جیب سے سگریٹ نکالا۔ دور بیٹھے اس کے کزن ہنس دیے وہ کس سے بات کر رہا تھا یہ تو انہیں پتا تھا۔ چند منٹوں بعد کال بند کی پھر جیب سے لائٹر نکالا۔ وہ بھی اٹھ کر اس کی سمت آ گئے۔ جیسے ہی سگریٹ منہ میں ڈالا اور لائٹر سے سلگایا۔ تو باقی سب بھی اسی کے پاس بیٹھ گئے۔

''فوجی ہو کر خود کی صحت سے اتنی غیر ذمہ داری؟'' کسی ایک نے کہا۔ وہ کش لگاتے ہوئے ہنس پڑا۔ بات بات پہ قہقہہ لگانا اسے بہت پسند تھا۔ وہ جواب دیتا اس سے پہلے مٹکے اٹھائے وہ لڑکیاں پھر سے آ چکی تھیں۔ اس نے نظریں اٹھائیں۔ دور کہیں دور جھیل جیسی آنکھیں اس کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ سرخ اور سفید رنگت لیے وہ ہنستے ہوئے جیسے بہار لگی تھی۔ گالوں پر پڑتے گڑھے بھی ساتھ کھلے۔ یوں لگا جیسے جاڑے میں پھولوں کے موسم کی آمد ہو گی ہو۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا، اس کے کزن بھی ساتھ ہو لیے۔

''ارے شہریار بھائی، بتانے دو چاچا بشیرے کو۔ پھر نکالیں گے تمہارے یہ شوق۔'' خوبصورت، سماعتوں کو بھلی لگنے والی آواز نے اس کے کانوں میں رس گھولا۔ گل شاد حسین نے

اسے آگے بڑھتے دیکھا، باقی سب بھی کھلکھلائیں۔ ان سب کے سروں پر مٹکے لدے تھے، جب کہ اس کی کہنیوں میں مٹی کا مٹکا دبا تھا۔ اس پر نقش ونگار بنائے گئے تھے۔ وہ سب کے ساتھ تھی۔ پر ایک وہی وہاں لگی تھی۔ وہ سب جیسی تھی پر وہ سب سے الگ تھی۔ جانے کیا چیز اسے ممتاز بناتی تھی، خاص بناتی تھی؟

شہریار نے خود کے ہاتھ میں سگریٹ کی ڈبی دیکھی، پھر کچھ کھسیا گیا۔

''یہ تو فوجی کی لڑکی ہے۔ ہم ایسے شوق سے دور بہتر۔'' اس نے اس کی طرف اشارہ کیا تو لڑکی نے مڑ کر اسے دیکھا۔ گل شاد حسین نے بھی اس طرف دیکھا۔ پھر وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

''یہ اتنے قہقہے کس بات پر لگائے جا رہے ہیں۔'' وہ اسی طرح کھلکھلاتی ہوئی جا رہی تھیں جب اس نے پوچھا۔ وہ سب مڑیں۔ اس کے بولنے پر حیران ہوئیں۔

''یقیناً موضوع ہم ہوں گے۔'' اس نے بول کر نظریں اس سرخ سیبوں جیسے گالوں والی لڑکی پر ٹکائیں۔ اس کے کپڑوں کا رنگ بھی سرخ تھا جو اس پر خوب کھلتا تھا۔

''آپ کو ایسا کیوں لگا؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ باقی سب پھر سے ہنس دیں۔

''آخر کو ہم میں سے کون کم ہے۔ سب دیکھنے میں ایک سے بڑھ کر ایک۔ پھر لڑکوں کی موجودگی میں اور کس چیز کا ذکر؟'' اس نے دلکشی سے کہا۔ اس کے کزن نے روکنا چاہا وہ شہر نہیں تھا جہاں اس طرح سرِ عام ایسی باتیں کی جائیں۔

''چچ چچ، آپ لڑکوں کو واقعی ایسا لگتا ہے؟'' سیاہ آنکھوں میں حیرت جھلملائی۔ اس نے دیکھا۔ وہ زبان سے زیادہ آنکھوں اور ہاتھوں سے باتیں کرتی تھی۔ سنہری آنکھیں زبان سے زیادہ گفتگو کرتی تھیں۔ سارے میں جیسے سردیوں کی دھوپ بھر گئی ہو۔ ٹھنڈی پر بھلی اور آرام دہ۔

''کیا غلط لگتا ہے؟'' وہ سب کچھ بھلائے بیٹھا تھا، پھر چاہے ہاتھ میں سگریٹ ہو یا کہاں کھڑا ہے وہ جگہ، یا پھر اردگرد کھڑے لوگ۔

''آپ لڑکے جب اکٹھے ہوتے ہیں۔اور قہقہے لگاتے ہیں تو ہوسکتا ہے آپ کا موضوع اگر لڑکی ہو تو اس کی خوبصورتی ہو سکتی ہے یا پھر کون کیسی ہے۔لیکن یہ بات یاد رکھیں۔'' وہ ہونٹ کاٹتے شرارت سے مسکرائی پھر ذرا آگے بڑھی۔

''ہم لڑکیاں جب ساتھ ہوں اور ہماری کھلکھلاہٹ سارے میں گونجے اور موضوع اگر لڑکا ہو تو ہم اس کی تعریف نہیں کرتیں نہ اس کی وجاہت کے قصے سناتی ہیں، نہ اس پر مر مٹنے کے واقعے، ہم اسے Roast کرتی ہیں۔ہم لڑکیاں ساتھ مل کر لڑکوں کو roast کرتی ہیں اور کیا ہی خوب کرتی ہیں۔'' وہ کہہ کر ہنسی اور پھر رخ موڑ کر اپنے راستے پر ہوگئی۔اس کی سکھیاں بھی مسکرادیں۔

اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔پھر ''آہ'' کہہ کر سگریٹ نیچے پھینکا جو پورا جل گیا تھا اور اب اس کا ہاتھ جلا رہا تھا پھر ساتھ کھڑے کزنز کو دیکھا۔ان کے چہروں پر سنجیدگی تھی اور کچھ ناگواری بھی۔اسے ہنسی آئی اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔سب نے اسے گھورا۔

''وہ بے عزتی کر گئی ہے اور تم قہقہہ لگا رہے ہو؟'' شہریار نے شرم دلانی چاہی۔

''نہیں وہ ہم لڑکوں کی بہت بڑی غلط فہمی دور کر گئی ہے۔'' وہ پھر سے پتھر پر بیٹھ گیا۔اس کی بھوری آنکھیں دور جاتی سنہری آنکھوں والی لڑکی کو دیکھ رہی تھیں۔

''کون تھی یہ؟'' پھر سرسری سا پوچھا۔باقی تینوں کزنز بھی ساتھ بیٹھ گئے۔

''غزل میر نام ہے پر رہنے دے یار۔یہ قسمت میں نہیں ہے ہم مغلوں کے۔'' شہریار نے اسے کہا۔

"تمہاری قسمت میں شہرین ہے اوران سب کی قسمت میں ان کی بیویاں، بچا میں تو میں خود کی قسمت خود طے کرلوں گا۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"چھوٹی ذات کی ہے فوجی۔ اور تو جانتا ہے ہمارے ہاں کیا رواج ہے۔" شہریار نے سنجیدگی سے کہا پر وہ کچھ نہ بولا۔ پھر زیرِ لب "غزل میر" کہا۔ نام بالکل اس پر جیسے جچتا تھا۔

☆......☆......☆

شام کے وقت ہلکے زرد رنگ کے کرتے کے ساتھ سفید شلوار پہنے، گلے میں پیلے رنگ کی پٹی ڈالے وہ تیار تھا۔ ایسی پٹیاں دلہن کے بھائیوں اور کزنز وغیرہ سب نے ڈال رکھی تھیں۔ دوستوں اور کزنز کے ساتھ شادی کے مزے لوٹنے سے لے کر کھانا اور مٹھائی کھانے تک اس کے ذہن سے غزل میر نہ نکلی تھی۔

پھر رات جب مہندی کی رسم لڑکیوں نے کرلی اور اس کے بھائیوں، باپ اور چاچا کو بلایا گیا تو اس میں اسے بھی بلایا گیا۔ وہ واحد کزن تھا جو شہر میں رہتا تھا پھر دلہن سے اس کا بھائیوں والا رشتہ تھا تو اسے بھی بلایا گیا۔ وہ ساتھ شہریار کو لے گیا۔ یہ عجیب بات تھی پر رواج یہی تھا۔ مرد چھت پر تھے جبکہ خواتین نیچے گھر میں اور صحن میں۔ چھت کے چاروں طرف تمبو لگائے گئے تھے تو نیچے کا منظر واضح نہ تھا۔ وہ نیچے چلے آئے۔ صحن میں ایک طرف مہندی کے پروگرام کے لیے سجاوٹ کی گئی تھی۔ ساتھ صوفے رکھے گئے تھے۔ ان کا تعلق چونکہ امیر گھرانے سے تھا تو رکھ رکھاؤ بھی امیروں والا تھا ورنہ پہلے کشمیر کی شادیوں میں صوفے، کیک، اور کیمرہ، اور باقی ولایتی چیزوں کا گزر نہ ہوتا تھا۔ یا تھا بھی تو بہت کم۔

وہ صحن میں آ گئے۔ اپنوں کو چھوڑ کے باقی خواتین سائیڈ پر ہوگئیں تو کوئی کمرے میں چلی گئی۔ اس نے ایک نظر سارے میں دیکھا۔ دلہن کے پاس موجود سب لڑکیاں زرد رنگ کی

شلوار قمیض میں ملبوس تھیں۔ جب کہ ان کے بیچوں بیچ کھڑی کسی لڑکی سے بات کرتی، اور پھر ہونٹ کاٹ کر مسکراتی غزل میر رنگ برنگے گھٹنوں تک آتے فراک کے ساتھ اسی کے ہم رنگ پٹیالا شلوار پہنے، سر پر سبز رنگ کا دوپٹہ اوڑھے کھڑی تھی۔ زرد رنگ کا پراندہ آگے کو ڈال رکھا تھا۔ اس نے بس ایک نظر میں اسے سر سے پاؤں تک دیکھا تھا حالانکہ اس کا نیم رخ تھا اس جانب۔ سنہری آنکھیں آج بھی سب میں خاص تھیں کیونکہ وہ خاص تھی یا لگتی تھی؟ پھر وہ آگے بڑھ گیا۔ پہلے بڑے بیٹھے، کیک کاٹ کر کھلایا، پیسے رکھے، تصاویر کھنچوائیں پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ زیادہ دیر وہاں نہیں رکے تھے اوپر مردوں میں آ گئے۔ ان کے جانے کے بعد بھائی بیٹھے۔ سائیڈ والے صوفے پر شہریار تھا ایک جانب، دوسری جانب گل شاد حسین۔ ان دونوں کے چچا کی بیٹی کی شادی تھی جو ان سے کافی چھوٹی تھی۔

''بھائی ہزار ہزار رکھیں گے ٹوکری میں جبکہ کزنز پانچ پانچ سو۔'' یہ غزل تھی جو اپنی دلہن دوست کے لیے پیسوں کی ڈیمانڈ کر رہی تھی۔ باقی سب لڑکیوں نے بھی تائید کی۔ نیچے دریاں بچھائی گئی تھیں جس میں باقی خواتین بیٹھی تھیں۔ ان میں سب سے آگے دلہن کی بہنیں، خاص کزنز اور دوست یعنی غزل بیٹھی تھیں۔

''ایک تو اتنا خرچہ پھر اوپر سے جہیز اور ساتھ میں اتنے پیسے؟ ہم کیا درختوں پر سے پیسے توڑتے ہیں؟'' گل شاد حسین نے ہنس کر کہا۔ باقی لڑکوں نے بھی ہامی بھری۔

''چچ چچ، بہن کا نوالہ بھی گنتے ہیں آپ لوگ؟'' معصومیت سے آنکھیں جھپکتے ہوئے غزل نے کہا۔ دور کہیں بوڑھیاں بیٹھیں گالیاں گا رہی تھیں۔ (پہاڑی زبان میں شادیوں میں یا خوشی کے موقع پر پہاڑی زبان میں گیت گائے جاتے ہیں جنہیں گالیاں کہتے ہیں۔ اکثر گھرانے ایسا فوتگی پر بھی کرتے ہیں۔)

"ظاہر ہے گننا پڑتا ہے آج کے دور میں بھئی۔" شہریار نے کہا تھا۔ سب ہنس دیے۔ پھر غزل کے کہے کے مطابق پیسے رکھ کر تصویر کھنچوا کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس بار کیمرہ تھامے کزن کو بھی ساتھ جانا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے وہاں آیا تھا۔ اب مردوں کی تصاویر بھی نکالنی تھیں۔ آگے بڑھتے ہوئے غزل کے پاس سے گزرتے ہوئے گل شاد حسین کا فون نیچے گرا جسے اٹھانے کے لیے وہ جھکا۔ کچھ گرنے پر غزل بھی متوجہ ہوئی۔

"تم تو واقعی غزل ہو۔" آہستہ سے نظریں اس کے چہرے پر ٹکائے کہا پھر موبائل اٹھائے سیدھا ہو گیا۔ غزل نے چونک کر پھر حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر طنزیہ مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔ غزل دلہن کی طرف متوجہ ہو گئی اور گل شاد حسین آگے بڑھ گیا۔ اس رات جب لکڑی کے بیڈ پر آنکھیں بند کیے گل شاد حسین لیٹا تو آنکھوں میں، دماغ میں، قلب میں، اور سوچوں میں صرف ایک چہرہ تھا۔ غزل میر کا چہرہ۔ وہ جو غزلوں جیسی تھی جس کا نام بھی غزل تھا۔

☆......☆......☆

بارات والے دن صبح سے گہما گہمی تھی۔ لڑکی نے زیادہ دور نہ جانا تھا۔ اس کی شادی خالہ زاد سے ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود بارات کے لیے صبح سے تیاریاں شروع تھیں۔ بارہ بجے بارات آنی تھی۔ لڑکی کا گھر رخصتی والے دن ہزار چہل پہل کے باوجود سونا سونا لگتا ہے۔ اور رخصتی کے بعد دلہن کے گھر کا سناٹا کھانے کو دوڑتا ہے۔ گیارہ بجے تک اس کی آنکھ کھلی تھی۔

اسے یاد تھا اس بیچ کئی بار اسے جگایا گیا تھا پر گل شاد حسین اس قدر تھک گیا تھا کہ سویا رہا۔

ناشتہ کر کے وہ سفید شلوار قمیض، ساتھ سیاہ رنگ کی واسکٹ پہنے تیار تھا۔ اس زمانے میں واسکٹ اتنی عام نہ تھی۔ اس پوری شادی میں واحد وہ تھا جس نے جیب میں سرخ رومال والی سیاہ واسکٹ پہنی تھی۔ سرخی مائل بال اور مونچھیں اس پر جچ رہی تھیں۔ فوجی کٹ بالوں میں وہ

اچھا لگتا تھا۔ پیروں میں سیاہ جوتے تھے۔ وہ ساتھ والے شہریار کے گھر میں تھا۔ شادی والے گھر شور وغل کی وجہ سے اس نے اس گھر کا انتخاب کیا تھا ورنہ اس کے ماں باپ وہیں تھے۔

وہ تیار ہو کر باہر آیا پھر مردوں کی طرف چل پڑا۔ سب مصروف تھے۔ شہریار بھی، تو وہ ایک جانب کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہاں موجود سب کچھ کرائے پر لایا گیا تھا۔ موبائل جیب میں پڑا تھا۔ ہزاروں کالز آئی تھیں اس کے دوستوں کی جن میں لڑکے لڑکیاں سب شامل تھے پر اس کا دل نہیں چاہا اٹھانے کو۔ وہ ویسے ہی بیٹھا تھا جب دور راستے سے اسے غزل آتی ہوئی نظر آئی۔ اس کے ساتھ چند لڑکیاں اور بھی تھیں۔ انہوں نے کچھ اٹھا رکھا تھا۔ وہ اتنی دور سے بھی اسے پہچان چکا تھا۔ ہمیشہ کی طرح چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ منہ سے زیادہ اپنے ہاتھوں سے باتیں کر رہی تھی۔ کرسی سے ٹیک لگائے وہ اسی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔ اس نے فقط ایک مرتبہ اسے دیکھا تھا اور بھری بھیڑ میں بھی اسے پہچاننے کے لیے دوسری نظر کی ضرورت نہ تھی۔

''تُو تو کہتا تھا نواز چند دنوں میں اس غزل میر کو اپنا اسیر نہ بنایا تو کہنا۔ کیا ہوا نکل گئی ہوا؟'' وہ بے اختیار چونک کے پیچھے مڑا۔ وہاں چند لڑکے کھڑے تھے۔ عمر میں اس سے کافی چھوٹے تھے۔ وہ اٹھائیس کا تھا جب کہ وہ انیس بیس سال کے تھے۔ یہ اس کے کزنز تھے وہ جانتا تھا۔

''تو ہم نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ وہ تم لوگوں کے بھائی پر پوری طرح فریفتہ ہے۔'' گل شاد حسین اپنی جگہ ششدر ہوا جبکہ نواز کے ساتھ کھڑے لڑکے بھی۔ گل شاد حسین نے اسے دیکھا۔ شاہ نواز کی فیملی کچھ عرصہ ہوا پنڈی شفٹ ہوئی تھی۔ اب بھی اِدھر ہوتے کبھی اُدھر۔ وہ اس کے باپ کے کزن کا بیٹا تھا بلکہ وہاں اس ٹولے میں موجود زیادہ لڑکے اسی طرح اس کے

رشتے دار تھے۔

''جھوٹ بول رہا ہے۔'' کسی دوسرے لڑکے نے گالی دیتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ تھے۔ نگاہیں وہیں تھیں جہاں سے کچھ دیر پہلے غزل اور اس کی سہیلیاں گئی تھیں۔

''میں کیوں جھوٹ بولوں گا؟ لڑکیاں مجھ پر مرتی ہیں یار۔ میں ہوں اتنا خوبصورت۔ کیوں صائم؟'' اس نے اپنے کزن کے بیٹے سے پوچھا جو اس جتنا ہی تھا تقریباً تو وہ بھی ہنس دیا۔ گل شاد نے بڑے غور سے اسے دیکھا۔ اسے اپنا یہ کزن ذرا پسند نہیں تھا اور صائم بھی۔ ہاں ٹھیک ہے وہ خوبصورت تھا۔ پر اس کا حلیہ ہمیشہ عجیب ہوتا تھا۔ جینز اور شرٹ ایسے ایسے رنگوں کی پہنا کرتا تھا کہ عورتوں کے پاس بھی اتنے رنگ نہ ہوتے۔ گلابی شرٹ کے ساتھ سرخ جینز کبھی تو کبھی پھولوں والی شرٹ کے ساتھ زرد رنگ کی جینز۔

چند لمحوں بعد جب وہ دونوں دوست وہاں سے گئے تو وہ اس کے پیچھے والی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ گل شاد حسین نے سوچا کیا واقعی؟

وہ صحیح سے جانتا بھی نہ تھا غزل کو۔ لیکن وہ لگتی تو ایسی نہ تھی۔ ہاں ٹھیک ہے وہ ہر کسی کے ساتھ بولنے والی لڑکی تھی لیکن اس کا دل جانے کیوں مان کے ہی نہیں دے رہا تھا۔

''جھوٹ بولتا ہے سالا۔ ہنس کر بول گئی ہوگی غزل اس سے، اسے لگا ہوگا پٹ گئی ہے۔ جب کہ غزل کی عادت سے ہم سب واقف ہیں۔'' چند لمحوں بعد انہیں باقی لڑکوں میں سے کسی کی آواز اسے سنائی دی۔ اس نے آسمان کی جانب آنکھیں کرلیں۔ نیلے آسمان میں کہیں کہیں سفید بادل تھے۔

''میں نے تو سنا ہے لڑکیوں نے اس کا نام رنگیلا رکھ چھوڑا ہے اس کے حلیے کی وجہ سے اور

جس نے یہ نام نکالا تھا وہ غزل میر ہے؟'' کسی دوسرے لڑکے نے کہا تو سب نے قہقہہ لگایا۔ وہ بھی مسکرا دیا۔

اس نے سوچا ہاں واقعی اس کی بہت سی لڑکیوں کے ساتھ دوستی تھی لیکن کیا کبھی اس نے کسی لڑکی کو اپنے دوستوں کے ساتھ ڈسکس کیا تھا؟ کبھی نہیں۔ اسے مردوں کی یہ عادت زہر لگتی تھی۔

وہ غزل میر کو بتانا چاہتا تھا کہ بے شک وہ لڑکوں کی محفلوں میں ہوتا ہے، اور اس کی لڑکیوں کے ساتھ دوستی بھی ہوتی ہے لیکن کبھی وہ لڑکیوں کو ڈسکس نہیں کرتا مردوں سے۔ لڑکیوں کے ناموں کا اشتہار نہیں لگاتا۔ انہیں بدکردار نہیں کہتا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک ہی چہرہ تھا۔

ایسا تو کبھی اس کے ساتھ نہ ہوا تھا۔ اتنے اعتماد سے تو کبھی دل نے کسی لڑکی کی حمایت نہیں کی تھی۔ اسے بہت برا لگتا تھا مردوں کا عورتوں کو ڈسکس کرنا۔ وہ موضوع بدل دیتا تھا۔ یہ سب اسے ناپسند تھا لیکن آج دل کے نہاں خانے میں اذیت کیوں ہوئی تھی؟ وہ سمجھ نہ سکا وہ کچھ بھی سمجھ نہ سکا۔

☆......☆......☆

رات نے اپنے پر جیسے ہی پھیلائے، آسمان نے بھی سیاہ بادلوں سے بھرنا شروع کر دیا۔ چونکہ لڑکے والے بھی رشتے دار تھے تو سب لڑکیوں کا رات دیر تک جاگنے اور محفل لگانے کا پروگرام تھا۔ بڑے سارے کمروں میں تھے، جہاں کہیں تاش کھیلی جا رہی تھی تو کہیں سیاست پر گفتگو جاری و ساری تھی۔ جب کہ چھوٹے سارے صحن میں لگائی گئی کرسیوں پر دائرے کی صورت بیٹھے تھے۔ اوپر چھت کی جگہ تمبو تھا۔

ہلاگلہ مچائے ساروں کے قہقہے آسمانوں کو چھو رہے تھے۔ وہ گانے گاتے، اس کے ہاتھ پاؤں توڑتے اور پھر قہقہہ لگا اٹھتے۔ چائے کے کئی دور چلے تھے۔ ابھی ابھی پیالیاں واپس گئی تھیں۔

''ہاں بھئی ہمارے مصنف صاحب بتائیں آپ کیا لکھتے ہیں؟'' شہریار نے اپنے دائیں جانب بیٹھے ایک لڑکے سے پوچھا۔ گل شاد حسین نے شہریار کے ساتھ بیٹھے لڑکے کو دیکھا۔ آنکھوں میں چشمہ پہنے وہ شرماتا ہوا مسکرا دیا۔ انیس بیس سالہ لڑکے کے اس عمل پر وہاں بیٹھے سارے مردوں نے قہقہہ لگایا۔

''کتابیں لکھتا ہوں ظاہر ہے۔'' پھر اس نے بتایا۔ چہرے پر پسینہ بھی صاف کیا۔ سب پھر سے ہنسے۔

''ناول۔'' پھر اضافہ کیا۔ گل شاد حسین کو بے اختیار اس پر ترس آیا۔

''اب کوئی نہیں ہنسے گا، بیچارے کو الجھا رہے ہو تم لوگ۔'' اس نے سب کو گھورا تو سب نے تائیدی سر ہلائے۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' پھر اس سے پوچھا۔

''قلمی یا اصلی؟'' اس مصنف نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ کوئی نہ ہنسا تو اس کی سانس میں سانس آئی۔ پر اگر وہ ارد گرد دیکھتا تو اسے سب کے چہروں پر مسکراہٹ صاف دکھائی دیتی۔ گل شاد حسین حیران ہوا۔

''دونوں؟'' پھر پوچھا۔

''اصل نام محمد ہے جب کہ قلمی نام محمد علی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''یہ دو نام کیوں؟''

''کیونکہ میرا نام محمد ہے اور میرے ابا کا نام بھی محمد بخش ہے۔ اس لیے میں نے محمد کے

ساتھ علی کا اضافہ کر کے قلمی نام رکھ لیا۔‘‘ اس نے بتایا تو گل شاد حسین نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔ وہ مقامی زبان میں بات کر رہے تھے۔ گل شاد حسین اتنے عرصے بعد کشمیر آنے کے باوجود پہاڑی انتہائی صاف ستھری بولتا تھا جیسے یہاں کے لوگ عموماً بولتے تھے کیونکہ پاکستان میں تو وہ اردو بولتا تھا لیکن گھر میں ماں باپ اس کے دونوں پہاڑی میں ہی بات کرتے تھے۔ اس لیے یہاں آ کر کشمیر میں اسے کوئی مشکل نہ ہوتی تھی۔ (پہاڑی اور کشمیری زبان تقریباً ملتی جلتی ہیں۔ کشمیری پورے آزاد کشمیر کی زبان تھی جبکہ پہاڑی مختلف علاقوں کی مختلف ہوتی تھی۔ جن میں بڑے اور واضح فرق تھے وہ الفاظ اور لہجے تھے۔)

’’کس موضوع پر لکھتے ہو محمد علی؟‘‘ اس نے پھر پوچھا۔

’’تم بچے کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو فوجی۔‘‘ شہریار نے کہا تو ہر طرف پھر قہقہے ابھرے۔

’’پہلے کشمیری سے ملا ہوں جو اردو زبان میں کہانیاں لکھ رہا ہے اس لیے پوچھ رہا ہوں۔ کیا پتا کل یہ بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع کر دے تو پھر ہمیں پہچاننے سے انکار کر دے۔‘‘ گل شاد حسین نے ہنستے ہوئے کہا لیکن وہ اس کے لب ہلتے دیکھ سکتا تھا جس نے زیرِ لب آمین کہا تھا۔ وہ قہقہہ لگا تا ہنس پڑا۔

’’ہاں بھئی بتایا نہیں تم نے؟ فوجی کو بتاؤ کس موضوع پر لکھتے ہو۔‘‘ کسی دوسرے نے بھی مزے لیتے ہوئے کہا تھا۔

’’مختلف موضوع ہوتے ہیں۔‘‘ وہ ایک بار پھر الجھنے لگا تھا۔

’’نمایاں کون سا ہوتا ہے؟‘‘ گل شاد حسین نے پوچھا۔

’’محبت۔‘‘ جیسے ہی اس نے کہا۔ سب نے ہوٹنگ کی۔

’’اووووووو......اوہوووووو۔‘‘

اتنے میں بجلی بھی کڑکی۔
''ہاں بھئی بتاؤ پھر محبت کیسی ہوتی ہے ہمیں بھی تو پتا لگے۔'' گل شاد حسین نے سب کو دیکھتے ہوئے کہا۔سب نے پھر تائید میں سر ہلایا۔بجلی چلی گئی تھی اب جنریٹر لگا تھا اس کی آواز بھی آنے لگی تھی۔ چونکہ جنریٹر تھا تو روشنی قدرے کم ہوگئی تھی۔
''جیسی ہوتی ہے محبت۔'' محمد علی نے اب کے اکتاہٹ سے کہا۔اتنے سارے لوگوں میں وہ کیسے بتاتا محبت کیا ہوتی ہے۔ کتابیں لکھنا الگ بات ہے اور اپنی کتابوں کے بارے میں سب کے سامنے بات کرنا الگ بات۔ ہر کسی کے پاس ایسا اعتماد نہیں ہوتا کہ وہ کتابیں لکھے بھی اور سب کے سامنے اس پر بات بھی کرے۔ ہنر الگ چیز ہے ہنر کا اعتماد الگ۔
''کیسی ہوتی ہے یہی تو پوچھ رہا ہوں۔'' وہ مسکراہٹ دبائے بولا۔ساتھ مونچھوں پر بھی ہاتھ پھیرا۔
''مجھے نہیں پتا۔آپ بتادیں۔'' اس نے اب کی بار قدرے غصے سے کہا تو سب ہنس دیے۔
''بھئی میں لکھتا تھوڑی ہوں محبت پر۔وہ تو تم لکھتے ہو۔ہاں میں پڑھتا ہوں بس۔'' گل شاد حسین نے کہا پر محمد علی نے نظروں کا رخ موڑ دیا وہ اب نہیں بولنے والا تھا یہ تو طے تھا۔
''تم کیا پڑھتے ہو فوجی؟'' اس کے ساتھ بیٹھے کزن نے پوچھا تو اس نے محمد علی کو دیکھا۔
''میں محبتوں کی کہانیاں پڑھتا ہوں۔'' پھر مسکراہٹ دبائے کہا تو سارے میں ایک بار پھر قہقہہ ابھرا۔وہ کہہ سچ رہا تھا لیکن اس وقت محمد علی کو زچ کرنا مقصد تھا۔
''شہر سے آئے ہو گل شاد حسین۔شہر والی محبت کے بارے میں ہی بتادو۔'' کسی نے چٹکلا چھوڑا تو گل شاد حسین کو جانے کیا ہوا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔پھر دائرے سے نکل کے تھوڑا آگے آیا۔
اب اس کی پشت تھی ان سب کی طرف۔

بوند بوند بارش برسنے لگی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تیز ہوتی گئی۔ جس گھر میں لڑکیاں تھیں وہ وہاں سے قدرے فاصلے پر تھا پر نظر آ رہا تھا۔ دو گھروں میں انتظام کیا گیا تھا شادی کا۔ ایک میں مرد تھے تو دوسرے میں خواتین۔ وہاں بھی مصنوعی روشنی جلی ہوئی تھی۔ بارش تیز ہوگئی۔ دور گھر کے برآمدے میں اسے کسی کا وجود نظر آیا۔ وہ جھیل سی آنکھیں تھیں جو برآمدے کے سرے کھڑی برستی بارش کو دیکھ رہی تھیں۔ سنہری آنکھیں اس وقت بارش کو برستا محسوس کر رہی تھیں۔ چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اور دونوں ہاتھ بارش کی بوندوں کو چھو رہے تھے۔ جہاں سب اس بے وقت کی بارش سے سخت جھنجھلائے ہوئے تھے وہاں وہ مسکراہٹ لیے بارش کو دیکھ رہی تھی۔

''محبت کا بھلا شہر یا گاؤں سے کیا تعلق؟ وہ تو پہاڑوں میں رہنے والوں سے بھی ہو جاتی ہے اور دراز قد مصنوعی عمارتوں میں بسنے والوں سے بھی۔'' اس نے کہا۔ نظریں بارش کی بوندوں سے ہوتی ہوئیں، دور ٹین والے گھر میں کھڑی لڑکی پر ٹکی تھیں۔ وہ غزل میر تھی وہ اسے پہچان لیا کرتا تھا۔ پھر چاہے بیچ میں کتنے ہی فاصلے کیوں نہ ہوں۔ پھر چاہے وہ کتنی ہی دور کیوں نہ ہو۔

''اوہووو۔'' سب نے پھر سے ہوٹنگ کی۔

''پھر یہ بتاؤ محبت کیسی دکھتی ہے؟'' شہریار نے اسے چھیڑا۔

اس کی نظریں اس گھر سے ہوتے ہوئے دور پہاڑوں پر گئیں۔ جو بجلی کے چمکنے سے روشن ہو جاتے تھے جن پر بارش مسلسل برس رہی تھی۔

''جب پہاڑوں پر بارش برستی ہے، پھولوں پر شبنم بیٹھتی ہے، ہواؤں سے سبز گھاس جھومتی ہے، درخت پہ لگے پتوں کی آوازیں سارے میں گونجتی ہیں۔ پرندوں کی چہچہاہٹ سحری کے

وقت گونجتی ہے۔اور دھنک کے سات رنگ جب خلا میں کھلتے ہیں مجھے لگتا ہے محبت اگر دکھتی تو بالکل ایسی دکھتی۔اور پوچھو محبت محسوس کیسے ہوتی ہے؟" اس نے نظریں گھمائیں، سیاہ جھیل جیسی آنکھیں اب بند تھیں۔وہ جیسے بند آنکھوں سے بارش محسوس کر رہی تھی۔

"بھلا کیسے محسوس ہوتی ہے محبت؟" کسی نے پوچھا۔

"محبت آنکھیں بند کر کے محسوس ہوتی ہے۔کیونکہ ہر خوبصورت چیز آنکھیں بند کر کے محسوس کی جاتی ہے۔اور محبت سے خوبصورت چیز بھلا کیا ہے؟" وہ مسکرا دیا۔دور غزل نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔اردگرد دیکھا ایک نظر اس طرف بھی دیکھا اور پھر بے اختیار رخ موڑ کے وہاں سے بہت سی لڑکیوں میں سے راستہ بنا کر اندر چلی گئی۔گل شاد حسین کو پتا تھا وہ اس کی محویت کی وجہ سے چونکی ہے ورنہ وہ اسے پہچان نہیں سکتی تھی اتنی دور سے۔

اور اس رات آنکھیں بند کرتے ہوئے گل شاد حسین کو پتا لگ چکا تھا کہ وہ گل شاد حسین اٹھائیس سال کی عمر میں محبت نامی خوبصورت بلا کے چنگل میں پھنس چکا ہے۔اس نے بند آنکھوں کے پیچھے غزل میر کا چہرہ دیکھا۔

And suddenly all the love stories were about her

دھیمے سے گل شاد حسین نے کہا۔

About Meer Gazal

دل میں ہلچل سی ہوئی۔اور دل نے بس ایک نام کی گردان شروع کردی۔وہ جو غزلوں جیسی تھی جس کا نام بھی غزل تھا۔

☆......☆......☆

فون کی بیل ہوئی تو وہ دونوں چونکے۔ اردگرد دیکھا تو وہ کشمیر کے پہاڑوں میں نہیں بلکہ پاکستان کے اس پارک میں بیٹھے تھے۔ یہ عیسیٰ کی موبائل کی گھنٹی تھی جس نے انہیں گل شاد حسین کی داستان کو روکنے پر مجبور کیا تھا۔

عیسیٰ نے موبائل اٹھایا اور سکرین سامنے کی۔ ماما کا نام سامنے جگمگا رہا تھا۔ اس نے کال اٹینڈ کی۔ پھر کہا۔

''السلام علیکم ماما۔''

''وعلیکم السلام! عیسیٰ کہاں ہو بیٹا؟ گھر کیوں نہیں آئے ابھی تک؟'' انہوں نے فکرمندی سے پوچھا تو وہ ہولے سے ہنس دیا۔ ماؤں کے لیے بچے ہمیشہ بچے ہی رہتے ہیں پھر چاہے وہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہو جائیں۔

''بس آ رہا ہوں ماما۔'' اس نے کہا پھر چند ایک باتیں مزید کیں اور کال کٹ کر دی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کپڑے جھاڑے۔

''آپ کی داستانِ حیات اس سے آگے کیا کل سننے کو مل سکتی ہے، اسی وقت؟'' پھر مسکراتے ہوئے گل شاد حسین سے پوچھا۔ وہ بھی کھڑے ہو گئے تھے۔

''کیوں نہیں۔ دلِ زار کی کیفیت پہلی دفعہ بیان کر رہا ہوں کسی سے، آدھی نہیں سناؤں گا۔'' وہ بولے اور پھر مصافحہ کیا۔

''ویسے اس عمر میں بھی ماں فون کر کے بلاتی ہے، بیوی کیوں نہیں لے آتے، عیسیٰ زبیر۔'' وہ جو آگے بڑھ رہا تھا، لمحے بھر کو رکا، اور رخ موڑ کر انہیں دیکھا۔

''میری شادی ہو چکی ہے جناب، چند دن پہلے ہی تو ہوئی ہے۔'' سادگی سے کہتے تیز تیز قدم اٹھاتا وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا، انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر بے یقینی سے مسکرائے۔

اگلے دن اسلام آباد میں صبح سے بارش کا امکان تھا۔ بادل نے سارے آسمان کو گھیر رکھا تھا پر برس نہیں رہے تھے۔ لیکن صد شکر موسم اچھا تھا۔ وہ فجر پڑھ کے پھر نہ سویا تھا۔ ٹیرس پہ آ کر ورزش کرتا رہا تھا۔ اسے دن میں ماما کو لے کر کہیں جانا تھا۔ ساتھ وہ دماغ کے گھوڑے بھی دوڑا رہا تھا۔

گل شاد حسین کی داستان میں آگے کیا ہوا ہوگا؟ شاید ذات کی وجہ سے ماں باپ نہ مانے ہوں گے اور یوں ان کی چاہت ادھوری رہ گئی ہوگی۔ یا پھر یہ بھی ہوسکتا تھا کہ شاہ نواز نے ولن کا کردار ادا کیا ہو اور شادی تک بات پہنچنے سے پہلے ہی کچھ ایسا ہو گیا ہو کہ ان کی چاہت انجام تک پہنچی ہی نہ ہو۔ ورزش کرنے کے بعد نیچے گلی میں ہلکی پھلکی واک کرتے ہوئے وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔

ذہن بھٹک کر ان کی کہانی میں الجھتا جا رہا تھا، لیکن خود کی داستان کو فراموش کر گیا تھا۔ کچھ دیر خود کی داستان کو بھلائے کسی اور کی کہانی کو سوچنا اور ان کرداروں کے ساتھ جینا آپ کو ذہنی الجھنوں سے چھٹکارا دلا دیتا ہے۔ پھر چاہے یہ تھوڑے وقت کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ چونکہ یہاں اونچے اونچے بنگلے ہی تھے۔ مطلب کہ رہائشی علاقہ تھا تو گاڑیوں کا گزر کم تھا اور جو تھا وہ صبح صبح اپنے کام پر جانے کے لیے ان بنگلوں کے مکین تھے یا ان میں بسے بچے جو سکول کالجز کے لیے جا رہے تھے۔ وہ خاموشی سے واپس گھر کی طرف بڑھ گیا۔ ساڑھے دس بجے ایک دفعہ پھر وہ نیچے آیا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اس بار ماما ساتھ تھیں۔

چند لمحوں بعد گاڑی اسلام آباد کی شاہرہ میں بھاگتی نظر آ رہی تھی۔

''تم نے چھٹیاں لی ہیں تو آج اسے لے آئیں گے۔''

ماما اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ باہر ہر طرف گہما گہمی تھی۔ ہر طرف بھانت

بھانت کی بولیاں۔ ہر طرف بھاگتے لمحے۔ گاڑی میں بیٹھ کر باہر کی دنیا کو دیکھنے کا بھی الگ ہی مزا ہے۔ ہر فرد اپنے آپ میں مگن ہر فرد اپنی زندگی میں الجھا ہوا۔

عیسٰی ماما کی بات پر کچھ نہ بولا بس اثبات میں سر ہلا دیا۔ گاڑی جس وقت صدر کے اس گھر کے پاس رکی تو بارہ بجنے میں کچھ وقت رہ گیا تھا۔ اس نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی۔ مشکلوں سے ہی لیکن گاڑی گلی کے اندر آ ہی گئی تھی۔ چند منٹوں بعد وہ بیل بجا رہے تھے۔ ماما ساتھ تھیں۔ دوسری بیل پر دروازہ کھل چکا تھا۔

''السلام علیکم! واہ بھئی آج انس بیٹا تو سویرے سویرے جاگے ہیں۔'' ماما نے سلام کرتے ہوئے سامنے کھڑے نوجوان کو چھیڑا۔ جو سفید رنگت لیے ہلکی بڑھی داڑھی اور السا نور سے مشابہت رکھتا تھا۔ اس کی صبح ڈھائی بجے ہوتی تھی سب کو پتا تھا۔ وہ کچھ جھینپ کر مسکرا دیا۔

''وعلیکم السلام! آپ لوگ کیسے ہیں؟ اندر آئیں۔''

عیسٰی سے گلے مل کر ماما سے پیار لے کر وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دونوں بھی ساتھ تھے۔ جیسے ہی دروازے کے اندر آئیں وہاں کھلا سا صحن تھا۔ جس کے ایک کونے پر مہمانوں کا کمرہ تھا جب کہ دوسری طرف زینے تھے جو چھت پر جاتے تھے۔ زینوں کے پاس پیچھے کی طرف اب نیا باتھ روم بنایا گیا تھا۔ صحن میں ایک طرف بائیک کھڑی تھی جس پر اس وقت کپڑا پڑا تھا تو دوسری طرف پانی کی بڑی بڑی بوتلیں۔ آگے پھر ایک دروازہ تھا جسے کھول کر اندر جایا جائے تو ایک لمبی راہداری تھی جس کے ایک کونے میں باورچی خانہ تھا جب کہ دوسری طرف دیوار میں نصب الماریاں۔ باورچی خانے کے ساتھ ایک کمرہ تھا اور اس کمرے کے ساتھ ایک اور کمرہ تھا۔

وہ جیسے ہی اندر بڑھے، باورچی خانے سے کمرے کی طرف آتی السا نور نے انہیں سلام

کیا۔ ماما نے اسے پیار کیا، حال احوال پوچھا پھر اندر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ انس ان کے ساتھ تھا۔

"آپ کیسے ہیں؟" الساء نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو عیسیٰ نے اسے دیکھا۔ لان کا بھورے رنگ کا سوٹ پہنے گلے میں دوپٹہ ڈالے وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔ بریانی کی خوشبو سارے میں پھیلی تھی۔

"الحمدللہ۔ آپ کیسی ہیں؟" دھیمے اور خوبصورت لہجے میں پوچھا۔ چہرے پر نرمی تھی۔

"میں بھی ٹھیک۔" اس نے کہا تو عیسیٰ نے اثبات میں سر ہلایا، پھر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ الساء اس کی پشت دیکھے گئی۔ وہ سفید رنگ کی شرٹ کے ساتھ سیاہ رنگ کی جینز پہنے کمرے میں گم ہو گیا تھا۔ جب کہ الساء پھر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

اسے اپنے شوہر سے محبت نہیں تھی لیکن پھر جانے کیوں ہر وقت اسی کا خیال رہتا تھا؟ اس کا پیغام نہیں آیا تھا وہ خود آ گیا تھا۔ وہ تیزی سے جام شیریں بنانے لگی۔ کھانے کی تیاری وہ پہلے سے ہی کر رہی تھی۔ اس سے لگتا تھا اسے اپنے سسرالیوں کی آمد کا پتا تھا۔ کھانا بے حد خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ زیادہ وقت انس الساء اور ان کی مائیں ہی باتیں کرتی رہیں، عیسیٰ بس تھوڑا بہت بولتا اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں سنتا رہتا۔ وہ خاموش طبع تھا تو دوسروں نے بھی اسے زیادہ بولنے پر نہیں اکسایا تھا۔

کھانے کے بعد عیسیٰ اور انس تو پاس والی مسجد میں چلے گئے جبکہ ان لوگوں نے اندر ہی نماز پڑھی۔ پھر چائے بنانے کی غرض سے الساء باورچی خانے میں چلی آئی۔ جس وقت وہ واپس کمرے میں آئی۔ امی کے پاس بیڈ پر اس کی ساس بھی بیٹھی تھیں۔ جب کہ عیسیٰ اور انس نیچے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے کھڑکی تھی جو گیلری میں کھلتی تھی۔ اس

نے سب کو چائے پیش کی اور خود بھی وہیں نیچے انس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

''میں چاہ رہی تھی عیسیٰ نے چھٹیاں لی ہیں السباء چلتی اپنے گھر لیکن آپ کی طبیعت بہت ناساز ہے۔ تو میرا خیال ہے کچھ دن یہیں رہے۔'' ماما نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

السا نے عیسیٰ کی طرف دیکھا، وہ ہاتھ میں ''دل دیا دہلیز بقلم رفعت سراج'' لیے بیٹھا تھا۔ السباء کو یاد آیا یہ کتاب پڑھتے ہوئے اس نے یہیں رکھی تھی، اٹھانا بھول گئی تھی۔

''میری طبیعت اب ٹھیک ہے، بہن جی، آپ السباء کو لے جائیں۔ ویسے بھی بیٹیاں اپنے گھر میں اچھی لگتی ہیں۔'' السباء کی امی نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔

''جی وہ تو دیکھ رہے ہیں ہم۔'' ماما نے مصنوعی طنز سے کہا تو سب نے مسکراہٹ دبائی۔

''میں تو کہتا ہوں بھئی میری شادی کروادیں، گھر میں بہو آجائے گی پھر ان محترمہ کو بھی نہیں جھیلنا پڑے گا۔'' انس نے اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔ سب ہنسے جبکہ چشمے کے پیچھے سے اس نے انس کو گھورا، نظریں انس پر سے ہوتی ہوئیں عیسیٰ کی طرف اٹھیں، وہ مسکراتا ہوا اسی کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے گڑبڑا کر نظریں پھیریں۔ اور چھپ کر انس کو اشارہ کیا۔ ''تمہیں تو میں بعد میں پوچھوں گی۔''

''مجھے سمجھ نہیں آتا آنٹی یہ بہنیں سسرال میں الگ اور میکے میں الگ کیسے ہوتی ہیں۔ سسرال میں ہر کسی سے باتیں کرتے وقت لہجے سے شہد ٹپکتا رہتا ہے اور بہن بھائیوں سے ایسے لڑتی ہیں کہ واللہ جیسے چڑیل ہوں۔'' انس نے باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگایا۔ سب نے پھر سے قہقہہ لگایا۔ سب سے اونچا قہقہہ انس کا تھا۔ السباء جتنی کم گو، معاملہ فہم اور سمجھدار تھی۔ انس اتنا ہی لاپروا، بولنے چالنے والا خوش مزاج سا تھا۔

''کیوں میری بہو کو تنگ کر رہے ہو، اس کا شوہر قریب بیٹھا ہے، کہوں اس سے تمہارے

کان کھینچے؟'' انہوں نے مصنوعی گھورا۔عیسیٰ پہلے گڑبڑایا پھر مسکرا دیا۔

''رہنے دیں آنٹی، عیسیٰ بھائی کو تو کوئی قتل بھی کرنے آئے گا ناں تو وہ خاموشی سے مسکراتے رہیں گے۔'' انس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ الساء نے ایک بار پھر انس کو گھورا۔

''بیٹا بعد میں تم ہاتھ لگو ذرا میرے۔''

عیسیٰ نے ہلکے سے اس کے بال پھیلائے۔ مزید کچھ نہ بولا البتہ مائیں دونوں پھر سے ہنسیں۔

''ہمیں اب چلنا چاہیے۔ مجھے شام کو کسی دعوت میں بھی جانا ہے زبیر کے ساتھ تو دیر نہ ہو جائے۔'' عیسیٰ کی ماما اٹھ کھڑی ہوئیں۔ باقی سب بھی ساتھ تھے۔

''چھٹیاں لی ہیں تو آنا پھر ادھر ہی بیٹا۔ دو تین دن رکنا ناں۔'' عیسیٰ پیار لینے کو جھکا تو ساس کا نقاہت بھرا لہجہ کانوں سے ٹکرایا۔ اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ الساء جو اپنی ساس کے ساتھ مصروف تھی کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ ہنستا نہیں تھا زیادہ لیکن مسکراہٹ اس کے چہرے کا حصہ تھی۔ دھیمی، نرم گرم سی، اور اپنائیت بھری مسکراہٹ۔ وہ سب باہر نکل آئے۔ آنٹی اور انس گلی میں آگے چلے گئے۔ وہ دونوں پیچھے تھے۔ یہ پرائیویسی ان دونوں نے خود انہیں دی تھی یا پھر انس نے، الساء نے سوچا۔

''آپ نے چھٹی کیوں لی ہے، سب خیریت؟'' الساء نے پوچھا۔ جھجک نہ تھی ان میں لیکن وہ رشتہ بھی نہ تھا۔ کچھ ادھورا ادھورا سا تھا۔ یوں تھا جیسے ایک گھر کا فرد دوسرے سے بات کر رہا ہو۔

''ہاں بس سوچا تھوڑا دماغ کو پُرسکون کرلوں پھر نوکری پہ جاؤں۔'' عیسیٰ نے بتایا۔ وہ

دونوں ساتھ چل رہے تھے۔ اس کے سوا دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ پر السباء نے اس کے ساتھ چلتے اس کی پرفیوم کی دھیمی خوشبو ضرور محسوس کی تھی۔ وہ تیز پرفیوم نہیں لگاتا تھا۔ ایک اور بات جو السباء نے غور کی تھی عیسیٰ زبیر کے پرفیوم ایک طرح کے نہیں ہوتے تھے۔ اس نے چند دنوں میں غور کیا تھا کہ وہ ہر دن الگ پرفیوم خود پر چھڑکتا تھا۔ جبکہ اپنی بیوی کے ساتھ چلتے عیسیٰ زبیر نے کن انکھیوں سے اس کے دائیں ہاتھ کو دیکھا۔ جہاں گھڑی پہنی گئی تھی۔ اس نے یہ بات غور کی تھی کہ السباء نورا الگ دن الگ گھڑی پہنتی تھی۔ بدل بدل کر لیکن کوئی ایک دن بھی ایسا نہ تھا جب اس نے دو دن ایک ہی گھڑی پہنی ہو۔

''آپ چاہیں تو اپنی کتابیں وہاں اپنے گھر لے جا سکتی ہیں۔'' اچانک عیسیٰ نے کہا تو السباء نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

''آپ کتابیں پڑھنے کی عادی ہیں۔ لیکن وہاں ہمارے گھر میں لائبریری نہیں ہے اور پھر آپ کی کتابیں یہاں آپ وہاں، اس لیے کہہ رہا تھا۔'' اس کے دیکھنے پر اس نے وضاحت دی۔ السباء نے اثبات میں سر ہلایا۔ ساتھ مسکراہٹ چہرے پر بکھری۔ ہاتھوں نے چشموں کو ٹھیک کیا۔

آسمان نے دونوں کو دیکھا۔ وہ دونوں دراز قد تھے۔ دونوں سفید نہ تھے۔ عیسیٰ کا رنگ براؤن تھا جب کہ السبا قدرے سانولی رنگت کی تھی۔ دونوں بہت زیادہ باتوں کے شوقین نہ تھے۔ دونوں جیسے ایک دوسرے کو مکمل کرتے تھے۔

''میاؤں...... میاؤں......'' عیسیٰ اور السباء دونوں کے قدم رکے۔ دونوں نے نیچے دیکھا۔ ان کے پیروں کے پاس سیاہ رنگ کی بلی کھڑی بول رہی تھی۔ آنکھیں نیلی تھیں یا سبز یا پھر دونوں سمجھ نہیں آیا۔ پھر وقت نے دونوں کی آنکھوں کو بیک وقت چمکتے دیکھا جہاں وہیں

زمین نے دونوں کو خود پر بیٹھتے محسوس کیا۔ سیاہ رنگ کی بلی نے دو ہاتھ اپنی پشت پر محسوس کیے۔
''میاؤں...... میاؤں۔'' تو ہوا نے بیک وقت دونوں کی آواز سنی۔ دونوں نے بیک وقت اپنے ہاتھ پیچھے کیے اور ایک دوسرے کو دیکھا پھر ہنس پڑے۔
''آپ کو بلیاں پسند ہیں؟'' عیسیٰ نے پہل کی۔ وہ بلی کو اٹھا چکا تھا دونوں کھڑے ہو گئے۔
''بہت۔ آپ کو بھی پسند ہیں ناں......'' اس نے عیسیٰ کے بازو کے ہالے میں بلی کو پیار کیا۔ وہ کسی کے گھر کی بلی (پالتو) نہ تھی بلکہ سٹریٹ کیٹ تھی، یہ اس کی حالت بتاتی تھی۔ عیسیٰ نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔
''میں ابھی آتی ہوں۔'' الساء تیزی سے واپس گھر کی جانب چلی گئی۔ اس کی واپسی چند منٹوں بعد ایک چھوٹی سی سفید رنگ کی کٹوری کے ساتھ ہوئی جس میں دودھ تھا۔ الساء نے کٹوری زمین پر رکھی تو دونوں پھر سے زمین پر پیروں کے بل بیٹھ گئے۔ بلی دودھ کی طرف لپکی۔ عیسیٰ کے ہاتھ اس کی پشت کو سہلا رہے تھے۔ خوبصورت ہاتھ جن میں رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ کثرت سے جم کرنے کا عادی تھا۔ لیکن ایسے نرم خوبصورت اور ابھری ہوئی رگوں والے ہاتھ اس کے پیدائشی تھے۔ جو سفید نہ تھے لیکن خوبصورت تھے۔ الساء نور نے لمحے بھر کو بے اختیار اسے دیکھا۔
عیسیٰ نے خود پر نظریں محسوس کیں تو اس کی جانب دیکھا۔ وہ اپنی نظروں کا رخ پھیر چکی تھی۔ پر وہ اسے دیکھے گیا رک کر، ٹھہر کر۔ الساء کے گال ہلکے سے سرخ ہوئے تو اس نے نظریں ہٹا لیں۔ پہلی مرتبہ عیسیٰ نے الساء کو شرماتے دیکھا تھا۔ وہ اتنی چھوئی موئی سی لگی تھی۔ وہ وہیں بیٹھے رہتے اگر انہیں انس کی آواز نہ سنائی دیتی۔ گہری سانس لے کر عیسیٰ اٹھ کھڑا ہوا پھر

اللہ حافظ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ سیاہ رنگ کی بلی کی پشت پر ہاتھ پھیرتے السماء نے اسے جاتے دیکھا تھا۔ وہ اسے تب تک دیکھتی رہی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

☆......☆......☆

رات وہ کریم رنگ کی شرٹ کے ساتھ ہلکے آسمانی رنگ کی جینز پہنے پارک میں واکنگ سائیڈ پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ گل شاد حسین بھی ساتھ تھے۔ پارک کے اس حصہ میں اور بھی بہت سے لوگ تھے۔ ہنستے مسکراتے، ٹولیوں کی صورت، جوڑوں میں۔ اپنی سوچوں میں گم۔

''تم شادی شدہ ہو؟ یہ بات میرے لیے حیرت انگیز تھی؟'' انہوں نے سنجیدگی سے اسے دیکھتے کہا۔ وہ سادہ سے ٹراؤزر کے ساتھ کھلی سی شرٹ پہنے عام سے حلیے میں تھے لیکن پھر بھی خوبصورتی تھی جوان پر ماند نہیں پڑتی تھی۔

''اس میں حیرت والی کون سی بات تھی؟'' وہ مسکرایا۔

''تمہارا کوئی مسئلہ چل رہا ہے اپنی بیوی کے ساتھ؟'' انہوں نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کو کیوں لگا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تم کسی الجھن میں ہو یا پھر کوئی چیز ہے جو تمہیں اذیت دیتی ہے لیکن بتاتے نہیں ہو؟'' انہوں نے اب بھی اس کے چہرے پر سے نظریں نہیں ہٹائی تھیں۔ بارش ابھی بھی نہ ہوئی تھی لیکن آسمان بادلوں سے بھرا پڑا تھا۔ ستارے دکھائی نہ دیتے تھے۔

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں بس تھکن کا شکار ہوں۔ جیسے ہی تھکن اترے گی، روح اور جسم دونوں پُرسکون ہو جائیں گے۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

''آپ نے کیا آج داستان نہیں سنانی اپنی، میں خاص اسی لیے آیا ہوں۔'' عیسیٰ زبیر

نے زیادہ دیر خود کو موضوع نہیں بننے دیا۔
''مطلب کہ تم محبت کے دوسرے مرحلے کو سننے کے لیے بیتاب ہو؟'' وہ افسردگی سے مسکرائے۔
''محبت کے بھی مرحلے ہوتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔
''محبت کے تین مرحلے ہوتے ہیں۔ میرے خیال سے تو کم از کم۔ میں تمہیں آخر میں بتاؤں گا تینوں مرحلوں کے بارے میں۔ فی الحال میں اپنی داستان کو جہاں سے چھوڑا تھا وہیں سے شروع کرتا ہوں۔'' گل شاد حسین جنت نظر، کشمیر کے پہاڑوں کے سفر میں نکل چکے تھے۔ ایک بار پھر عیسیٰ زبیران کے ساتھ تھا۔

☆......☆......☆

رات موسم نے جو جل تھل کیا تھا اس کے اثرات صبح میں بھی نظر آتے تھے۔ گھاس نم تھی، پھول مہک رہے تھے۔ البتہ زمین میں جو کیچڑ تھا وہ دھوپ کی وجہ سے سوکھ گیا تھا بس مٹی نم تھی۔ گل شاد حسین نے سوچ لیا تھا اسے کیا کرنا ہے۔ وہ صبح ہی صبح شہریار کو لے کر گھومنے نکل چکا تھا۔ اسے شہریار سے دوٹوک بات کرنی تھی۔ پہلے وہ مظفر آباد کے گاؤں سے سیدھا وہاں کے بازار آئے تھے۔ جگہ جگہ گھومتے، دکانیں کھنگالتے انہیں کافی وقت بیت چکا تھا۔ یہ بازار آج کے بازار سے بے حد مختلف تھا۔ جہاں اس وقت ذرائع مواصلات سے زیادہ انسانوں کا شور تھا۔ پھر وہ تقریباً دوپہر کے وقت چائے پینے کے لیے ایک پرانے ہوٹل میں بیٹھے۔ وہاں کی کشمیری چائے بڑی مشہور تھی۔ (عموماً لوگ گلابی چائے کو کشمیری چائے سمجھتے ہیں جب کہ کشمیری چائے مختلف ہوتی ہے۔) یہ مظفر آباد آج کے مظفر آباد سے بہت مختلف تھا۔ چونکہ دوپہر ہو چکی تھی تو گل شاد حسین نے کھانا بھی منگوایا، چائے بعد کے لیے رکھ چھوڑی۔ وہ

دونوں چارپائی پر بیٹھ گئے۔

''میں غزل میر سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' شہریار جو ہنس کر جانے کیا کہنے والا تھا ٹکر ٹکر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد وہ ہنس دیا۔

''بہت اچھی جگت تھی۔'' پھر بولا۔

''میں غزل میر سے شادی کرنا چاہتا ہوں شہریار بشیر۔'' اب کی بار گل شاد حسین نے چبا چبا کر ایک ایک لفظ کہا تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ شہریار کا جیسے سانس رک گیا تھا۔

''دیکھ فوجی! میں نے تمہیں پہلے سے بتا رکھا ہے کہ اس کی ذات......''

''مجھے غزل کی ذات سے نہیں غزل سے شادی کرنی ہے۔ تم یہ بتاؤ اس کا کہیں رشتہ تو نہیں ہوا۔'' گل شاد حسین نے سختی سے اس کی بات کاٹی۔

''اونہوں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بے اختیار مسکرایا۔ اسے پتا تھا گاؤں میں اگر کسی کا رشتہ ہو جاتا تو یہ بات ڈھکی چھپی نہ رہتی تھی۔

''اچھی بات ہے۔ غزل میر کو لکھا ہی گل شاد حسین کے لیے گیا ہے۔'' اس نے دور پہاڑوں کے اوپر اُفق کو دیکھا۔ وہ اُفق جو بے حد خوبصورت تھا۔

''یہ تم کن راستوں پر چل پڑے ہو گل شاد حسین؟'' شہریار نے مستقبل کے خوف سے کہا تھا۔

''ان راستوں میں کہاں کوئی اپنی مرضی سے آتا ہے؟ یہ محبتوں کے راستے تو خود کھینچ لاتے ہیں۔'' وہ دلکشی سے مسکرایا۔ نیلگوں آسمان میں جگہ جگہ چاند جیسے سفید بادلوں کے ٹکرے نظر آتے تھے۔

''تایا کبھی نہیں مانیں گے اور نہ ہی خاندان والے۔'' شہریار نے اسے حقیقت سے روشناس کروایا۔ ایک بیرہ بڑی سی پیتل کی تھال اٹھائے جس میں کھانا تھا قریب چلا آیا۔ وہ

دونوں چارپائی کے دونوں سرے پر بیٹھے تھے۔ بیچ میں تھال رکھ کر بیرہ چلا گیا۔
سرسوں کا ساگ، ساتھ گا ھنیار (ایک ہری دیسی سبزی جو کشمیر میں بہت پسند کی جاتی ہے) دو بڑے بڑے پیتل کے گلاسوں میں لسی جس کے اوپر مکھن نظر آتا تھا۔ ساتھ چٹنی اور مکئی کی روٹیاں۔ بے اختیار دونوں کا موڈ خوشگوار ہو گیا تھا۔ اسے کشمیر کا کھانا بہت پسند تھا۔ (پہلے وقتوں میں مکئی کا آٹا بنا نمک کے گوندھا جاتا اسی طرح چاول بھی بنا نمک کے بنائے جاتے اور سالن یا سبزی وغیرہ میں نمک کی مقدار بڑھائی جاتی تا کہ ذائقہ بالکل وافر مقدار میں ہو۔)
کھانے سے فارغ ہو کر انہوں نے چائے کی دو دو پیالیاں پیں۔ واقعی لکڑیوں پر بنی چائے کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ پھر کشمیری چائے کا مقابلہ تو ویسے بھی ناممکن ہے۔ کشمیری چائے کا مزہ بھی الگ ہی مزہ تھا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب ان کا ارادہ گھر جانے کا تھا۔
''اگر گھر میں نہ مانے تو؟'' شہریار نے چلتے ہوئے پوچھا۔ سرمئی جینز کے ساتھ سیاہ آدھے آستین والی شرٹ پہنے گل شاد حسین مطمئن سا تھا۔ وہ ہر چیز کو بہت ہلکا لینے کا عادی تھا، یہی چیز وہ یہاں بھی ظاہر کر رہا تھا۔ لیکن کیا واقعی شادی اتنی آسان چیز ہے؟
''میں ان کی واحد اولاد نہیں ہوں شہریار۔ میری وہ ضد نہیں مانیں گے مجھے پتا ہے۔ کوئی اور وجہ ہوتی تو میں سوچ لیتا لیکن صرف ذات کی بنا پر میں غزل سے شادی نہ کروں، ایسا میرے لیے ممکن نہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے شہریار کو دیکھتے ہوئے کہا۔ شہریار نے اس کی آنکھوں میں اپنے فیصلے پر ثابت قدمی محسوس کی۔
''تم بس یہ بتاؤ تم میرا ساتھ کہاں تک دو گے؟'' پھر اس سے پوچھا۔
''تو میرا دوست ہے فوجی اور تایا زاد بھی۔ تجھے لگتا ہے تیرا بچپن کا دوست تجھے اکیلا چھوڑے گا؟ دوستوں کے لیے کچھ بھی، کبھی بھی۔'' شہریار نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو

گل شاد حسین مان سے مسکرا دیا۔

دوست بھلے مشکل وقت میں کام نہ آئیں، لیکن ان کا ساتھ نبھانے کا عہد ہی انسان کو ایک مان سا بخش دیتا ہے۔ زندگی میں کئی پہر ایسے آتے ہیں جب ہمارے بہت قریب کے دوست، ایسے دوست جو دل میں بستے ہوں ہمارے ساتھ نہیں ہوتے۔ وقت انہیں ہم سے عہد نبھانے نہیں دیتا لیکن یہ تسلی کے وہ ہیں، دور آسمان کے نیچے اس آسمان کے نیچے جس کے تلے ہم بھی ہیں حوصلہ بڑھا دیتے ہیں۔ دوست کی موجودگی ہر لمحے پر بھاری ہوتی ہے لیکن دوست کی غیر موجودگی جیسے ہر مزے کو بدمزہ کر دیتی ہے۔

شام کو بت فیرا تھا۔ اس لیے انہوں نے تیزی سے گھر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ (کشمیر میں بارات کے اگلے دن دلہن واپس اپنے میکے آتی تھی، اور وہاں بھی عزیز و اقارب کو کھانے کی دعوت پر بلایا جاتا تھا کشمیر میں ولیمہ نہیں ہوتا۔ پرانے وقتوں میں بارات والے دن لڑکی کے ہاں صرف چائے اور رس (پاپے) دیے جاتے تھے اور مٹھائی۔ کھانا لڑکے کے ہاں ہوتا تھا۔ لیکن اب دونوں دن کھانا بنایا جاتا تھا۔ جب لڑکی میکے جاتی تھی اس دن تمام رشتے داروں اور دوستوں کو کھانے کی دعوت دی جاتی تھی اسی طرح جب واپس لڑکی اپنے سسرال جاتی تو یہ اہتمام لڑکے والوں کی طرف سے ہوتا تھا۔)

☆......☆......☆

اگلے دو دن شادی کا واویلہ ختم ہو گیا اور یوں غزل بھی اپنے گھر چلی گئی۔ اسی شام گل شاد حسین کو اپنے ماں باپ سے بات کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ وہ سب سے چھوٹا تھا۔ باقی سب کی شادی ہو چکی تھی تو اب اس پر شادی کا زور تھا۔ اس لیے اس نے مزید تاخیر نہیں کی۔ کمرے میں اس وقت محمد حسین اور ان کی اہلیہ کے سوا صرف گل شاد حسین تھا۔

''اماں! میں نے لڑکی پسند کرلی ہے۔ اور آپ کی خواہش کے عین مطابق لڑکی کشمیر سے ہی ہے۔'' وہ لکڑی کی کرسی پر بیٹھا تھا جب کہ وہ دونوں میاں بیوی بیڈ پر۔ اس کی بات سن کر دونوں مسکرا دیے۔ شکر تھا ان کے اس فوجی بیٹے کو بھی عقل آئی تھی۔

''صرف کشمیر سے نہیں بلکہ خاندان سے بھی میری خواہش ہے۔'' اماں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اماں! وہ خاندان سے نہیں ہے اور نہ ہی رشتے دار ہے۔ بلکہ......'' وہ لمحے بھر کو رکا۔ اس نے ماں باپ کے مسکراتے چہرے کو سنجیدگی میں بدلتے دیکھا۔

''وہ ہماری ذات کی بھی نہیں ہے۔'' اس نے بات مکمل کی۔

''پھر اسے بھول جاؤ۔ تمہارے سارے بھائیوں کی شادی خاندان میں ہوئی ہے اور تمہاری بھی یہیں ہوگی۔ ہماری برادری میں خاندان سے باہر شادی کرنے کا رواج نہیں ہے۔'' ابا نے گہری سنجیدگی سے کہا تھا۔ ماتھے پر بل تھے وہ اپنا غصہ ضبط کررہے تھے۔

''میرے بھائیوں نے کی ہے میں اپنے بھائیوں جیسا نہیں ہوں، یہ آپ کو پتا ہے۔ اور شادی میں اسی سے کروں گا جس کا کہہ رہا ہوں۔'' گل شاد حسین نے بھی انہی کے انداز میں کہا۔ ابا بیڈ سے نیچے اتر آئے تھے۔

''تمہاری بے جا ضد میں پوری کبھی نہیں ہونے دوں گل شاد۔ تم یہ سوچ لینا کہ تم نے خاندان میں رہنا ہے یا کسی ذات سے باہر کی لڑکی سے شادی کرنی ہے۔'' یہ کسی کا گھر تھا تو وہ دھیمے مگر طیش بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ وہ بھول گئے تھے کہ وہ اپنے پانچ چھ سالہ بیٹے سے بات نہیں کررہے جو ڈانٹ ڈپٹ سے ان کی بات مان جائے گا، وہ اٹھائیس سالہ اپنے فوجی بیٹے پر اپنی مرضی تھوپنے کی کوشش کررہے تھے۔ جو نہیں کرسکتے تھے۔ اولاد جوان ہو

جائے تو پھر ڈانٹ ڈپٹ کام نہیں آتی۔

''آخر مسئلہ کیا ہے آپ لوگوں کو؟ خاندان سے باہر شادی کرنا گناہ تو نہیں ہے۔'' گل شاد حسین جھنجھلایا۔ اسے پتا تھا یہ ساری بحث بیکار تھی۔ لیکن وہ ایک بار کوشش کرنا چاہ رہا تھا۔ اماں خاموشی سے اپنے شوہر اور بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ دونوں صرف شکل وصورت سے ایک دوسرے پر نہ تھے بلکے عادتیں اور جذبات بھی ایک جیسے تھے۔ دونوں کا غصہ تیز تھا اور دونوں ہی اپنی اپنی کرنے والے تھے۔

''خاندان کا مطلب تم کیا جانو۔ اور چلو خاندان سے باہر کی بات ہوتی تو ہم بے دلی سے شاید مان جاتے ...... شاید۔'' انہوں نے شاید پر زور دیا۔

''لیکن کسی دوسری ذات کی لڑکی کو ہم اپنے گھرانے میں نہیں لائیں گے۔ اور مجھے اب مزید بحث نہیں چاہیے۔'' ابا نے دوٹوک کہا۔

''ذات کون سا لڑکی سے چلتی ہے؟ نسل تو باپ کی ذات پر چلتی ہے۔ ابا میں مغل ہوں میری نسل بھی مغل ہوگی۔'' اس نے آخری کوشش کی۔ باپ کا چہرہ سرخ ہوتے وہ دیکھ سکتا تھا۔

''ہم مغل ہیں گل شاد حسین اور مغلوں کا خون خالص ہوتا ہے۔ میں نہیں چاہتا میری اگلی نسل میں کسی قسم کی ملاوٹ ہو۔ مغل مغل ہوتا ہے۔'' ابا نے اس بار دھاڑتے ہوئے کہا۔ آواز باہر تک گئی ہوگی۔ پر اب جیسے ان کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

''نہ کیا کریں میرے سامنے چوبیس سو گھنٹے مغل ...... مغل ...... مغل ...... جو واقعی مغل تھے اب نہیں رہے۔ جن کے کام مغلوں والے تھے، جو حکمرانی کرتے تھے، جو اپنا آپ منوانا جانتے تھے، جو نڈر تھے، جو ہنر مند تھے۔ اب کے مغلوں میں رہا کیا ہے؟ اب تو دوسری ذاتیں ان سے آگے نکل گئی ہیں۔ مغلوں کے پاس اب صرف نام ہے ورنہ مثال وہی ہے، اونچی

دکان پھیکا پکوان۔'' گل شاد حسین نے بچپن سے لے کر جوانی تک کی مغلوں پر اپنی ساری بھڑاس نکالی۔ وہ تنگ آ گیا تھا ان نام نہاد ذاتوں کے امتیاز سے۔ آخر کب تک یہ قومیں ذات پات، رنگ و نسل سے نکل کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں گی۔ ذات اور فرقہ آخر کب تک مسلمانوں میں زیر بحث ہوگا؟

''شرم آنی چاہیے تمہیں۔ دوبارہ مغلوں کے بارے میں منہ سے لفظ نکالا تو یہیں زندہ درگور کر دوں گا تمہیں۔''

گل شاد حسین نے بے یقینی سے اپنے باپ کو دیکھا اور پھر آگ نکالتے اپنے رخسار کو چھوا جہاں محمد حسین کا تھپڑ زور سے لگا تھا۔ اس سے پہلے وہ اپنا ضبط کھو دیتا وہ دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ دروازے کے سامنے ایک نفری تھی جسے وہ نظر انداز کر کے غصے سے کھولتے گھر سے ہی نکل گیا تھا۔ یہ تھپڑ اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کے والدین، اس کی برادری اور اس کا خاندان کبھی غزل میر سے اس کی شادی کے لیے ہامی نہیں بھریں گے۔ اور پھر فیصلہ لمحوں میں ہو گیا تھا۔ اُسی شام وہ شہریار کو لے کر پہاڑوں پر بنے اس چھوٹے سے مٹی کے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ گھر کے اردگرد پھلوں کے درخت اب تک پھیلے تھے۔ یہاں دھوپ زیادہ نہیں پڑتی تھی جس کی وجہ سے یہ درخت ابھی تک ایسے تھے۔ گلابی، سفید پھولوں سے سجے۔ چیری بلوسم۔ چونکہ گرمیاں تھیں تو وہاں رات کا کھانا بنانے کے لیے باہر آگ جلائی گئی تھی۔

''غزل کی ماں۔'' شہریار نے چولہے کی طرف اشارہ کر کے اسے بتایا، سرگوشی میں۔ گل شاد حسین نے غزل کی ماں کو دیکھا جو چولہے کے آگے بیٹھیں ہنڈیا میں چمچ ہلا رہی تھیں۔ وہ ان کی طرف متوجہ نہ تھیں۔

''السلام علیکم چاچی۔'' شہریار نے بلند آواز میں سلام کیا تھا جس سے وہ چونک پڑیں۔

پھر چولہے پر سے دیگچی اتار کر وہ ان کی طرف آ گئیں۔ قدرے بوکھلا کر۔

"وعلیکم السلام شہریار پتر۔ یہاں اندر چلے آؤ۔" وہ دونوں کو لیے اندر کی طرف بڑھ گئیں۔ ساتھ حال احوال بھی پوچھا۔ گل شاد حسین نے بغور کمرے کا جائزہ لیا۔ مٹی سے لیپا گیا کمرہ بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ دھیمی دھیمی مٹی کی خوشبو، اوپر گولا (کھانے والا نہیں بھئی۔ گولا ایسے پتھر کو کہتے ہیں جو زرد، سفید یا نیلے رنگ کا ہوتا ہے۔ وہ دوسرے پتھر سے قدرے نرم ہوتا ہے۔ پانی میں ڈالنے سے بالکل نرم ہو کر ٹوٹ جاتا ہے اور سارا پانی جس رنگ کا گولا ہوتا ہے اسی میں رنگ جاتا ہے۔ چاک مٹی ڈال کر پھر وہ دیواروں پر کیا جاتا ہے جس سے مٹی کی دیواریں خوبصورت لگنے لگتی ہیں) کر کے رنگوں سے نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ دو چارپائیاں بھی رکھی گئی تھیں۔ ایک طرف دیوار میں شیلف نصب تھی جس پر خوبصورت کپڑا بچھایا گیا تھا۔

وہ دونوں ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ انہیں بٹھا کر وہ باہر نکل گئیں۔ چند لمحے بعد قدرے فربہ سے چھوٹے قد کے شاہ میر صاحب آ گئے۔ وہ بے حد حیران تھے۔ خاص کر شہریار کے ساتھ گل شاد حسین کے وہاں آنے پر۔

"کیسے ہیں آپ شہریار صاحب، فوجی بابو آپ بھی خیریت سے ہیں؟" وہ پاس چلے آئے پھر زمین پر بنڈے (لکڑی کا بنا چھوٹا سا موڑا بیٹھنے کے لیے) پر بیٹھنے لگے۔ گل شاد حسین کا خاندان امیر و کبیر تھا۔ پھر جاگیردار تھا جہاں وہاں مغل تھا۔ باقی ذاتیں ان کے برابر بیٹھنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ احتراماً بھی تھا اور حیثیت کی بنا پر بھی شہریار کے لیے یہ عام بات تھی، جب کہ گل شاد حسین کو کبھی ایسی چیزیں پسند نہیں آئی تھی۔

"چارپائی پر بیٹھیں چاچا۔ آپ بڑے ہیں۔ پھر آپ کا اپنا گھر ہے۔" گل شاد حسین نے

بے اختیار انہیں ٹوکا تو وہ مسکرا دیے۔ سانولے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی جیسے کسی بچے کی نادانی پر بڑے کے چہرے پر ہوتی ہے۔ وہ نیچے بیٹھ چکے تھے۔ کمرے میں کچھ بچھایا نہ گیا تھا۔ مٹی کا فرش اچھا لگتا تھا۔

''آپ کے اور ہمارے معیار میں بڑا فرق ہے فوجی بابو۔ ہم کیسے اوپر بیٹھ سکتے ہیں آپ کی برابری میں؟'' وہ رسانیت سے بولے۔

گل شاد حسین نے چند لمحے سوچا۔ یہ بہت مشکل تھا لیکن اس نے اپنے لیے ساری زندگی کی مشکل چن رکھی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا پھر شاہ میر کے بالکل سامنے رکھے بنڈے پر بیٹھ گیا۔ شہر یار اور شاہ میر دونوں اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔

''یہی بات ہے تو ہم نیچے بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ نہیں بیٹھ سکتے میری برابری میں تو میں آپ کی برابری میں بیٹھ جاتا ہوں۔ آپ بڑے ہیں اور محترم ہیں۔ اب تو مزید ہو گئے ہیں۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے بولا۔ آخری جملہ آہستہ سے بڑبڑایا تھا۔

شاہ میر یوں اچھلا جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔

''فوجی بابو! آپ......''

''ہمارا وقت اوپر نیچے کرنے سے ضائع ہو رہا ہے۔ میں یہاں کچھ ضروری بات کرنے آیا ہوں۔'' اس نے ان کی بات مکمل نہ ہونے دی۔ شہر یار نے گہری سانس لی اور پھر گل شاد حسین کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ ہاں ٹھیک ہے وہ کسی اور کے لیے زمین پر نہیں بیٹھ سکتا تھا لیکن اپنے اس فوجی دوست سے اسے بڑی محبت تھی، جس کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ شاہ میر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اتنے میں دو پیتل کے بڑے بڑے گلاسوں میں غزل کی امی لسی لے آئیں۔ دروازے میں لمحے بھر کو وہ ٹھٹک کر رکیں۔ پھر عجلت میں اندر آ گئیں۔

''آپ نیچے کیوں بیٹھے ہیں فوجی بابو، شہریار پتر!اوپر چارپائی پر بیٹھیں۔'' انہوں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔گل شاد حسین نے ان سنی کر کے گلاس اٹھالیا اور پھر شہریار نے بھی لے لیا۔

پھر وقت سرکتا گیا۔گل شاد حسین بولتا گیا۔شاہ میر اور حُسنِ جان سنتے رہے۔شہریار بھی تائیدی سر ہلا لیتا، بیچ بیچ میں۔مغرب سے کچھ وقت پہلے وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔پھر آگے پیچھے چلتے چاروں نفوس کمرے سے باہر نکل کھڑے ہوئے۔

''میں چاہتا ہوں آپ مجھے کل تک جواب دے دیں۔اگر جواب ہاں میں ہے تو میں اپنی اگلی چھٹی پر غزل میر کو اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہوں۔اور اگر نہ میں ہے تو یہ بات یہیں ختم ہو جائے گی۔آپ کی بیٹی کے لیے میرا کبھی رشتہ آیا تھا اس بات کا علم کسی کو نہیں ہوگا۔'' دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔ان کے اثبات میں سر ہلانے پر وہ دونوں واپسی کے لیے نکل گئے۔

گھر سے تھوڑا دور آ کر کچھ نیچے سے بغل میں مٹکا دبائے پہاڑوں کی غزل میر نظر آئی۔جہاں گل شاد حسین کے چہرے پر بے پناہ مسکراہٹ نے ڈیرا ڈالا وہیں غزل میر اس فوجی کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔شہریار پہلے نیچے اترا، پھر اس کی طرف مسکراہٹ اچھالتے آگے بڑھ گیا جب کہ گل شاد حسین وہیں کھڑا تھا۔غزل میر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اوپر کی طرف بڑھنے لگی۔اب دونوں کے بیچ چند قدم کا فاصلہ تھا۔وہ سفید سوٹ میں ملبوس تھی۔دوپٹہ سرخ تھا جو سر پر تھا۔آنکھوں میں کاجل تھا۔جو سنہری آنکھوں کو مزید خوبصورت بناتا تھا۔

''مہمان گھر آتے ہیں لیکن میزبان گھر سے غائب۔کیا یہ طریقہ اچھا ہے پہاڑوں میں رہنے والوں کا؟'' گل شاد حسین نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔سورج غروب ہونے کے

در پے تھا۔غزل کی پشت پر سورج کی آخری کرنیں لگتی تھیں جہاں وہیں انہی کرنوں نے گل شاد حسین کو گھیرا ہوا تھا۔اس کی بھوری آنکھیں دھوپ کی کرنوں سے بے حد خوبصورت لگنے لگی تھیں۔ایسے جیسے سورج ان میں سما گیا ہو۔اس کے سرخی مائل بال بھی اچھے لگ رہے تھے۔

''امی ابو گھر پر ہی ہیں۔'' غزل نے بے ساختہ کہا۔

''ہاں وہ تو مل گئے تھے اب ان سے جو مانگا ہے بس وہ مل جائے۔'' اس نے بے اختیار کہا۔تو لمحے بھر کو غزل میر ششدر رہوئی۔کوئل کی کوک مزید تیز ہوئی۔مویشیوں کی آوازیں بھی بلند سے بلند ہوتی گئیں۔گل شاد حسین کا چہرہ، مسکراہٹ بھرا چہرا کھل اٹھا۔غزل میر سن سی اسے دیکھے گئی۔وہ چھوٹی بچی تو نہ تھی کہ اس کی یہ بات سمجھ نہ پاتی۔

''میں سمجھی نہیں آپ کی بات؟'' لیکن پھر بھی اس نے پوچھا یا کہا وہ بھی سمجھ نہیں پایا۔

''ہم آپ کے لیے دنیا چھوڑ دیں گے۔'' گل شاد حسین نے اسی انداز میں کہا۔اس نے دیکھا، سہیلیوں کے نرغے میں بہت بولنے والی غزل میرا کیلے میں بے جھجک مسکراتی تھی نہ ہی بے تکلف ہوتی تھی۔

''چھوڑ دیں گے؟ آپ کو کہنا چاہیے تھا ہم دنیا کو چھوڑ آئے ہیں۔'' غزل میر نے لب کھولے اور پھر اسے کہا۔یہ بے اختیار تھا۔وہ باتونی تھی، موقع شناس تھی۔اگلے کو لاجواب کرنا اسے خوب آتا تھا۔گل شاد حسین چند لمحے واقعی لاجواب ہوا تھا۔

''ہم اپنی بات کی تصیح کرتے ہیں۔ہم دنیا کو چھوڑ آئے ہیں۔اور واقعی چھوڑ آئے ہیں۔'' وہ مسکرایا سورج مکمل طور پہ غائب ہو چکا تھا۔

''ہم برابری کی سطح پر نہیں ہیں۔آپ اوپر کھڑے ہیں جب کے ہم نیچے ہیں۔'' غزل میر نے جیسے اسے باور کروایا۔وہ اس کے اوپر کھڑے ہونے اور اپنے نیچے کھڑے ہونے کی بات

کررہی تھی۔ وہ دوسرے لفظوں میں خود کے فرق کو بیان کررہی تھی، واضح کررہی تھی، گل شاد حسین نے چند لمحے اسے دیکھا پھر دھیرے دھیرے چند قدم نیچے اترا۔ اب وہ دونوں برابر کھڑے تھے۔ چند قدموں کے فاصلے پر۔ ایک جیسی سرزمین پر۔ وہ قد میں اس سے چھوٹی تھی۔ اسے بے اختیار احساس ہوا۔

''اب تو ہیں ناں ہم برابری کے معیار پر؟'' وہ مسکرا کر بولا۔ پوچھا یا آگاہ کیا اسے سمجھ نہیں آیا۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہوئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو چند پل ٹھہر کے دیکھا۔ اور پھر گل شاد حسین ایک طرف ہوگیا۔ یہ اشارہ تھا کہ اب اسے جانا چاہیے۔ وہ اسے راستہ دے رہا تھا۔ غزل میر آگے بڑھ گئی اور گل شاد حسین اپنے راستے ہوگیا۔ دونوں نے پیچھے مڑ کے نہ دیکھا۔ گل شاد حسین نے پہلی بار غزل میر کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی دیکھی تھی۔ جب کہ اپنے گھر کے راستے پر جاتے ہوئے غزل میر نے محبتوں کا ایک جہاں دیکھا تھا گل شاد حسین کی آنکھوں میں۔

☆......☆......☆

وہ اور شہریار واپس گھر کی طرف آگئے تھے۔ غزل کے گھر سے شہریار کے گھر تک کا ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ تھا۔ وہ دوسرے گاؤں کی رہنے والی تھیں۔ وہ تیز تیز اور بڑے بڑے قدم اٹھا رہے تھے۔ چونکہ انہیں گھر پہنچنے کی جلدی تھی اس لیے راستہ بھر میں ان کی کوئی بات نہ ہوئی۔ شہریار کو اس سے بات کرنے کا موقع رات میں ملا۔ وہ دونوں وہیں گھر کے ایک طرف آ گئے۔ بڑوں کی اپنی رونقیں تھیں چھوٹوں کے اپنے مشغلے۔ وہ ان سے الگ تھلگ ہوگئے۔ وہ دونوں ساتھ ہوتے تو کسی تیسرے کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوتی تھی۔

''دیکھ فوجی! ابھی بھی وقت ہے سوچ لے تُو۔'' شہریار نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ کی

ڈبیا لیتے ہوئے کہا۔ گل شاد حسین نے اپنا سگریٹ سلگا لیا تھا۔
''جو سوچنا تھا سوچ چکا۔'' وہ کش لیتے ہوئے بولا۔ یہ سگریٹ اس نے اپنے سکول کے زمانے میں شروع کیا تھا، وہ بھی ابا سے چھپ کر۔ یہ پہلی چیز تھی جو ابا سے اس نے چھپائی تھی اور پھر اس کے بعد کئی چیزیں تھیں جو بھید میں تھیں اور رہنی تھیں۔ یہ بھی بڑی انوکھی بات ہے لڑکے جو چیز والدین سے سب سے پہلے چھپاتے ہیں وہ سگریٹ ہوتی ہے اور لڑکیاں جو چیز خفیہ رکھتی ہیں وہ ڈائجسٹ ہوتے ہیں۔
''پر خفیہ کیسے رکھو گے شادی کو؟'' اس نے پوچھا۔ ساتھ کش بھی لگایا۔ کھانسی ہوئی پھر وہ سنبھل گیا۔ وہ عادی سموکر نہ تھا۔ بس کبھی کبھار دوست کی سنگت میں پی لیتا تھا۔ دوست سے مراد گل شاد حسین تھا۔
''رکھ لوں گا۔'' اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔
''اور اگر انہیں پتا لگ گیا تو؟''
''مجھے جائیداد کی فکر نہیں ہے شہریار، میں فوج میں ہوں۔ سرکاری نوکری ہے، تنخواہ ہے، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میرے والدین کے پاس ان کی باقی اولادیں ہیں۔ لیکن میں انہیں چھوڑ نہیں سکتا۔ میں انہیں اس سارے عرصے میں منانے کی کوشش کروں گا، ناراضگی سے بھی اور پیار سے بھی۔'' وہ اب زمین کو دیکھ کر کہہ رہا تھا۔
''وہ میرے ماں باپ ہیں شہریار اور مجھے عزیز ہیں۔ میں انہیں کھونا نہیں چاہتا۔ نافرمانی الگ چیز ہے اور قطع تعلقی الگ چیز۔ میں نافرمانی تو کر سکتا ہوں اپنے ماں باپ کی لیکن قطع تعلقی؟ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ نافرمانی سے انہیں تکلیف ہوگی تو مجھے دکھ ہوگا لیکن قطع تعلقی سے انہیں اذیت ہوگی اور مجھے تکلیف۔ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ ماں باپ، ماں باپ

ہوتے ہیں وہ بہت کچھ برداشت کر لیتے ہیں اولاد کے لیے۔ لیکن اولاد میں یہ ظرف کم ہوتا ہے۔ تم مجھے خود غرض کہہ سکتے ہو لیکن میں اس معاملے میں خود غرض بننا چاہتا ہوں، رہنا چاہتا ہوں۔'' وہ اسی طرح کش لیتا دھیما دھیما کہہ رہا تھا۔ شہر یار کچھ فاصلے پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے دل کی باتیں اکثر اس سے کہہ دیتا تھا۔ وہ اس کا کزن تھا، وہ اس کا دوست تھا۔ شہر یار بشیر اور گل شاد حسین کی دوستی نایاب دوستی تھی۔

''میرے ماں باپ کوئی اور وجہ بتاتے تو میں پھر کچھ سوچتا لیکن صرف ذات کی بناء پر میں اپنی محبت سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ ایک ایسی چیز کی بناء پر جو میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ میں انسان ہوں، میں مسلمان ہوں۔ گل شاد حسین انسان ہے، گل شاد حسین مسلمان ہے۔ وہ انسان ہے وہ مسلمان ہے۔ غزل میری انسان ہے، غزل میر مسلمان ہے اور بس اتنا کافی ہے مجھے اسے اپنانے کے لیے۔'' وہ گہری سانس لیتا کسی اور سوچ میں گم کہہ رہا تھا۔

''یہ کیسی محبت ہے جو چند دنوں میں اتنی شدت اختیار کر گئی؟'' شہر یار اپنا سگریٹ پی چکا تھا جبکہ گل شاد حسین دوسرا آدھا ختم کر چکا تھا۔ آسمان میں ستارے پوری شان سے چمک رہے تھے۔ چاند کے بیچ کی کوئی تاریخ تھی۔

''محبت میں شدت نہیں ہوتی نہ ہوسکتی ہے۔ محبت ہمیشہ ایک سی ہوتی ہے اسے دنوں سے فرق نہیں پڑتا۔ وہ وقت کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ بھلا وقت اور محبت کا کیا تعلق؟'' وہ مسکراتا ہوا اسے کہہ رہا تھا۔

''وہ ہنس مکھ اور خوش مزاج لڑکی ہے جانتا ہوں۔ لیکن دل اس کے پاس بھی ہے اگر وہ کہیں اور کسی اور سے محبت کرتی ہوئی تو؟'' شہر یار نے گھور کر ڈبیا اس سے لے کر جیب میں ڈال دی۔ وہ تیسرا سگریٹ پینا چاہ رہا تھا۔

''وہ ایسی نہیں ہے۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''پھر بھی؟'' شہر یار بضد ہوا۔

''غزل میر کے جذبات ان چھوئے ہیں۔ان پر پہلی مہر گل شاد حسین کی ہی لگے گی۔اور میری یہ بات پتھر پر لکیر ہے۔'' وہ دلکشی سے مسکرا دیا۔

''اور اگر اسے تمہارا پتا چلا؟ تمہارے جذبات تو ان چھوئے نہیں ہیں......'' شہر یار نے اسے بغور دیکھا۔وہ مرد تھا مرد کی فطرت سے بھی واقف تھا۔

''میرے جذبات ان چھوئے ہیں، ہاں میرا وقت بہت سو میں بٹا تھا، اب نہیں بٹے گا۔ میں نے آج اسے بولا میں اس کے لیے دنیا چھوڑ دوں گا اس نے کہا مجھے کہنا چاہیے تھا میں اس کے لیے دنیا چھوڑ آیا ہوں۔اور تمہیں پتا ہے شہر یار میں واقعی اس کے لیے دنیا چھوڑ آیا ہوں۔اور پھر کل جواب اگر ہاں میں ہوا تو اس کے بعد غزل میر ماضی میں کیا تھی میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔اور گل شاد حسین کیا تھا اس سے غزل میر کا کوئی تعلق نہیں۔ہم جب ایک دوسرے کو قبول کریں گے تو اپنے آج سے کریں گے۔گزرے کل کو بیچ میں نہیں لائیں گے۔'' وہ ستاروں بھرے آسمان کو دیکھ کر کہہ رہا تھا۔جب چاند نہ ہو تو ستارے پوری شان سے دمکتے ہیں۔لیکن جب چاند آ جاتا ہے تو ستارے ہوتے تو ہیں لیکن نظر آنا بند ہو جاتے ہیں اور جو دکھتے ہیں وہ معنی نہیں رکھتے۔گل شاد حسین کے لیے بھی غزل میری وہی ماہتاب تھی۔جب وہ تھی تو سب تھا۔

☆......☆......☆

اگلی صبح خوب دھوپ بھری ہوئی تھی۔آسمان میں بادل دور دور تک نظر نہ آتے تھے۔ شہر یار اور گل شاد حسین گاؤں کا چکر لگا رہے تھے۔آج گل شاد حسین کا آخری دن تھا کشمیر

میں، شام میں اسے راولپنڈی کے لیے نکل جانا تھا۔

''میری بات آپ پوری سنیں گے آرام سے۔ جب میں بات مکمل کروں گا آپ کا جو اعتراض ہوا جو سوال ہوا بعد میں کیجیے گا۔'' گل شاد حسین لسی کا خالی گلاس نیچے رکھتے ہوئے بولا۔ اس نے حُسنِ جان کو بھی شاہ میر کے قریب بیٹھنے کے لیے کہا تھا اور وہ بیٹھ چکی تھیں۔

''میں آپ کی بیٹی کو اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہوں چاچا۔ میری خواہش ہے آپ غزل میر کو گل شاد حسین کے ساتھ بیاہ دیں۔'' وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ جب کے غزل کے ماں باپ ٹکر ٹکر ششدر سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے تھے۔

''پورے خاندان میں سب سے ہی اچھی بنتی ہے لیکن تم واحد میرے کزن دوست ہو شہریار۔ تمہارے ساتھ کا شکریہ۔'' وہ دونوں چہل قدمی کر رہے تھے جب گل شاد حسین نے کہا۔ شاہ میر جواب دینے خود آئے گا وہ کہہ چکا تھا۔ شہریار نے مسکراتے ہوئے گہرا سانس لیا۔ اسے وہ دن یاد آیا جب وہ دونوں ایک دن رات میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

''تم جانتے ہو شہریار، میرا دل کرتا ہے کسی ایسی جگہ میرا گھر ہو جہاں کوئی نہ ہو۔ جب میں کشمیر آؤں بس کھاؤں پیوں، اور سو جاؤں۔ کسی سے ملنا نہ پڑے۔ کسی کو دیکھنا نہ پڑے۔ اور پھر کئی دن ایسے ہی گزار کر واپس شہر لوٹ جاؤں۔'' وہ جیسے کسی اور رو میں کہہ رہا تھا۔ اس نے شہریار کو نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی وہ شہریار کے دل تک پہنچ سکتا تھا۔ گل شاد حسین نے یہ بات کرتے ہوئے ایک پل کے لیے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ اپنے ایک دوست سے یہ کہہ رہا ہے۔ اپنے دوست سے یہ کہہ رہا ہے کہ اس کے ملک میں آ کر وہ سب کے ساتھ ساتھ اس سے بھی نہ ملے۔ گل شاد حسین کی زندگی میں تو دوستوں کی بہتات تھی جبکہ شہریار کی زندگی میں تو چند دوست تھے۔ اور وہ بھی بعض دفعہ ایسا دل دکھا دیتے کہ سہنا مشکل ہو جاتا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔

بات بدل گئی۔ دن رات بدل گئے، سب کچھ بدل گیا اور شہریار بشیر دوستوں کی محبت میں بات اور دوست میں سے دوست کو چن بیٹھا ہمیشہ کی طرح۔ دوست دوست اسی لیے ہوتے ہیں کہ انہیں کچھ کہنے سے پہلے سوچنا نہ پڑے۔ دوست زندگی میں آپ کے بہت سے حصوں کو مکمل کر دیتے ہیں۔ ہم زندگی میں جسے سب سے زیادہ معاف کرتے ہیں، مار جن دیتے ہیں وہ دوست ہوتا ہے۔ اور ہمیں یہ دونوں کام کرنے بھی چاہئیں۔ دوستوں کے لیے کچھ بھی۔

''کیا کروں لگتے زہر ہو لیکن ہو تو میرے کزن اور دوست ہی ناں۔ دوستوں کے لیے کچھ بھی، کبھی بھی۔'' شہریار نے ماضی کو جھٹکا اور مسکرا دیا۔

''میں نے گھر میں بات کی تھی لڑکی کا نام نہیں لیا لیکن وہ لوگ خاندان سے باہر شادی کرنے کو تیار نہیں ہیں اور نہ ہی ذات سے باہر۔ میرے لیے مشکل ہے کسی ایک کو چننا۔ اس لیے میں یہ شادی کچھ عرصہ خفیہ رکھنا چاہتا ہوں اگر آپ ہاں کریں گے تو۔'' گل شاد حسین بغیر رکے کہے جا رہا تھا۔

''میں زبردستی غزل کو اپنے ماں باپ پر نہیں تھونپ سکتا اور نہ اپنے ماں باپ کی ناپسندیدگی غزل کو جھیلنے دے سکتا ہوں۔ اس لیے میں چاہتا میں اس سے نکاح کر کے الگ گھر میں رکھوں۔''

وہ دونوں واپسی کے راستے پر تھے جب انہیں شاہ میر اور ایک سولہ سترہ سالہ لڑکا نظر آئے۔ وہ دونوں انہی کی سمت چلے آ رہے تھے۔ قریب آنے پر انہیں وہ لڑکا شاہ میر کا ہم شکل لگا۔ بس عمروں کا فرق تھا۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے آہستہ آہستہ قدم اٹھانے شروع کیے۔

''اور یہ سب میری طرف سے ہے۔ میں نے آپ کی بیٹی کو شادی میں دیکھا تھا۔ پھر شہریار سے پوچھا تو اس نے بتایا غزل کے بارے میں۔ غزل میر تو شاید مجھے جانتی بھی نہ ہو۔

لیکن میں چاہتا ہوں آپ اپنے ساتھ ساتھ غزل کی مرضی بھی پوچھیں۔''

شہریار نے تائیدی سر ہلایا۔

''باقی میں کوئی وعدہ نہیں کر رہا لیکن میں اسے تمام عمر خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔ غزل میر گل شاد حسین کے ساتھ مطمئن رہے گی یہ عہد رہا میرا آپ کے ساتھ۔'' گل شاد حسین نے گہری سنجیدگی سے یہ بات کی تھی۔

''فوجی بابو! ہمیں بڑی خوشی ہوگی یہ رشتہ جوڑ کے۔ میری غزل کی قسمت ہے جو اسے آپ جیسا شوہر ملے۔ لیکن......'' شاہ میر نے چلتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر جیسے خوشی کے ساتھ ساتھ فکر بھی تھی جو وہ کہہ نہیں پا رہا تھا۔

''لیکن؟'' گل شاد حسین نے پوچھا۔ سرخ مونچھوں تلے ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ جو تصورِ جاناں سے آئی تھی۔ جواب صرف محبوب نہیں رہی تھی شریکِ حیات بننے جا رہی تھی۔

''آپ کا اور ہمارا فرق اور پھر کل اگر میری بیٹی کی زندگی میں......''

''آپ بے فکر رہیں چاچا۔ کم از کم مغلوں کی اس بات پر تو آپ کو اعتبار ہے ناں کہ وہ جب نکاح میں لے لیتے ہیں کسی لڑکی کو تو اس کا ساتھ آخری دم تک نبھاتے ہیں؟ میں یہ نہیں کہہ رہا غزل میر کی زندگی میں غزل گل شاد حسین بن کر کوئی مشکل نہیں آئے گی بس فرق یہ ہوگا صرف کہ میں اور وہ ساتھ ہوں گے ان مشکلات میں۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''باقی تو کوئی اعتراض نہیں؟'' شہریار نے پوچھا تھا اس بار۔

''نہیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''آپ نے غزل سے پوچھا۔'' گل شاد حسین نے پوچھا۔ وہ مکمل جواب چاہتا تھا۔ جو اس کی ہاں کے بغیر ناممکن تھا۔

”وہ پہاڑوں کی بیٹی ہے فوجی بابو۔ پہاڑوں میں رہنے والے ماں باپ کے بڑے فرمانبردار ہوتے ہیں شادی بیاہ کے معاملے میں۔ اس نے کہا ابو جیسا آپ لوگ چاہیں۔“ انہوں نے فخر سے کہا۔

”ہاں بھئی غازان! میاں گل شاد حسین بہنوئی کے روپ میں پسند ہے تمہیں کہ نہیں؟“ گل شاد حسین نے کچھ شرماتے، کچھ مسکراتے اس لڑکے سے پوچھا، جو تھا تو غزل سے بھی تیز لیکن شہر کے رہنے والے اپنے ہونے والے بہنوئی سے شرما رہا تھا۔

”میں بھی میٹرک کے بعد فوج میں جاؤں گا۔“ غازان نے کچھ پرجوش انداز میں کہا۔ شہریار کے ساتھ ساتھ شاہ میر بھی اس کے ایسے اعتراف پر قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔

☆......☆......☆

اور پھر وقت گزرتا گیا۔ گل شاد حسین شہر آ گیا۔ تین مہینے بعد واپس کشمیر جانا تھا لیکن چھے ماہ بعد چھٹی ملی، تو وہ کشمیر چلا آیا۔ اس بار وہ اپنے رشتے داروں سے ملنے نہیں گیا نہ کسی کو پتا تھا وہ کشمیر آیا ہے۔ گھر میں بھی اس نے بتا رکھا تھا وہ دوستوں کے ساتھ کہیں سیر کو جا رہا ہے ان چھٹیوں میں۔

وہ چاروں نفوس پہاڑوں پر چلتے جا رہے تھے۔ تین خاموش تھے صرف ایک کے لب ہل رہے تھے۔

”فی الحال آپ صرف ان رشتے داروں سے بات کریں جن پر آپ اعتماد کر سکتے ہیں۔ اگلے سال شاید میری پرموشن ہو جائے تو پھر مجھے گھر حکومت کی طرف سے ملے گا تب میں دھوم دھام سے غزل کو دنیا کے سامنے لے کر جاؤں گا بیوی کے روپ میں۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

''ہمارے زیادہ تر رشتے دار تو دوسرے ضلع میں ہیں۔ یہاں بھی آپ نے دیکھا ہوگا ہمارا گھر بالکل الگ تھلگ ہے۔ لیکن ہاں کچھ پڑوسی ہیں جو بھروسے لائق ہیں۔ آپ فکر نہ کریں فوجی بابو۔'' شاہ میر سنجیدگی سے جواب دیا۔

گل شاد حسین کے ساتھ شہر یار اور شہر یار کا ایک دوست جو دوسرے گاؤں میں رہتا تھا مغل نہیں تھا لیکن اس کی ذات کم تر بھی نہ تھی۔ وہ تینوں شاہ میر کے گھر پہنچ گئے۔ شاہ میر نے پہلے ہی نکاح کا بندوبست کر رکھا تھا۔

عصر کے بعد جمعہ والے دن گل شاد حسین اور غزل میر کا نکاح ہو گیا۔ پہاڑوں پر بنے اس گھر میں رہنے والی غزل میر اب گل شاد حسین کی ہو چکی تھی۔ سرشاری ہی سرشاری تھی جو گل شاد حسین کے رگ وپے میں اتر رہی تھی۔ محبت کا دوسرا مرحلہ با آسانی پار ہو گیا تھا۔ رات تک وہیں تھے سب۔ سب نے کھانا کھایا، مٹھائی کھائی۔ پھر مغرب سے کچھ دیر بعد سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ غازان اور شاہ میر گل شاد حسین کے ساتھ کمرے میں جبکہ اماں اور غزل باہر چولہے کے پاس بیٹھ گئیں۔ چونکہ بجلی ابھی زیادہ گھروں میں نہ تھی تو اس وقت باہر بھی لال ٹین جلا تھا اور اندر بھی۔

وہ دہکتے کوئلے کے پاس بیٹھیں کھم (بھٹے) بھون رہی تھیں ساتھ ساتھ اندر بیٹھے مردوں کو بھی دے رہی تھیں۔ رات جب گہری ہونے لگی تو انہوں نے گل شاد حسین کو آرام کرنے کی غرض سے دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ یہ وہ کمرہ تھا جس میں وہ پہلی دفعہ بھی آیا تھا۔

پہاڑوں میں بنے اس گھر میں دو کمرے تھے۔ ایک میں غزل اور اس کی اماں سوتے تھے اور ایک میں غازان اور شاہ میر۔ کشمیر میں رواج یہی تھا ازل سے۔ بچے بڑھے ہو جاتے تو ماں باپ کے کمرے بھی بٹ جاتے۔ باہر پڑی چارپائی پہلے ہی اندر رکھی جا چکی تھی۔ تو اب ایک

کمرہ گل شاد حسین اور اس کی بیوی کا تھا جب کہ دوسرے کمرے میں باہر پڑی چارپائی کا اضافہ کرلیا گیا تھا جس میں حُسنِ جان سوئی تھی۔ کچھ دیر آرام کے بعد گل شاد حسین لکڑی کا دروازہ کھول کر کے باہر آ گیا۔ باہر ہر سو چاندنی تھی۔ چاند کی چودھویں نے ہر طرف چاندنی بکھیر دی تھی۔ وہ برآمدے میں آیا پھر گھومتا ہوا گھر سے تھوڑا دور۔ اسے سرخ جوڑے میں چاندنی کے ہالے میں بیٹھی وہ نظر آ گئی تھی۔ اس کی پشت تھی اس کی طرف۔ وہ مسکرادیا، پھر چلتا ہوا قریب آیا۔

''السلام علیکم!'' یہ چھے مہینوں بعد پہلی بار تھا جب وہ آپس میں بات کر رہے تھے۔

''وعلیکم السلام! بڑی دیر کردی۔'' غزل نے رخ نہیں موڑا۔ سادگی سے کہا۔ وہ کس دیر کی بات کر رہی تھی گل شاد حسین سمجھ چکا تھا۔ محبت کے فلسفے الگ تھے۔ عجیب تھے۔ محبت میں مبتلا دولوگ ایک دوسرے کی بے معنی باتوں کو، معنی خیز باتوں کو، ان کہی باتوں کو سمجھ لیتے تھے۔ سمجھ لیا کرتے تھے۔ وہ اس کے بائیں جانب چند قدموں کے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ اب دونوں کی نظریں دور افق پر پوری شان سے چمکتے چاند پر تھیں۔ چاند جو بیک وقت خوبصورت اور دلفریب تھا۔ چاند جو افق کے نیچے ارض سے اوپر تھا۔

''بس مجبوری تھی۔'' اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔

''تمہیں پتا ہے محبت میں سب سے خوبصورت چیز کیا ہوتی ہے غزل؟'' پھر اس نے رخ موڑ کے اسے دیکھا۔ وہ ہمیشہ والے روپ میں تھی۔ کسی بھی میک اپ سے پاک چہرہ ہاں البتہ آنکھیں کاجل سے بھری تھیں۔ اس کا نیم رخ تھا گل شاد حسین کی طرف۔ وہ رخ جس میں ٹھوڑی پر تل بڑا واضح تھا۔

"موجودگی۔ محبوب کی موجودگی۔" غزل میر نے بھی رخ موڑ کے اسے دیکھا۔ گل شاد حسین بھی ویسا ہی تھا۔ ویسے ہی سرخی مائل بال، ویسی ہی سرخ مونچھیں، ویسی خوبصورت مسکراہٹ۔ اور بھوری آنکھیں۔ وہ اس کے جواب میں اثبات میں سر ہلا کر اطمینان سے مسکرایا۔

چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھنے کے بعد نظریں پھر چاند پر ٹک گئی تھیں۔ وہ سیاہ لباس میں ملبوس تھا، وہ سرخ لباس پہنے ہوئے تھی۔ گل شاد حسین کے سرخی مائل بال سلیقے سے کنگھی کیے ہوئے تھے جہاں وہاں سرخ چادر کے پلوں میں چھپے اس کے سیاہ، سیدھے اور گھنے بال بل کی صورت کمر پر پڑے تھے۔ وقت سرکتا گیا۔ وہ دونوں خاموشی سے بیٹھے رہے۔ الفاظ دونوں کے پاس نہ تھے۔ لفظ جیسے بے معنی تھے یا ان دونوں کی قربت میں ہو گئے تھے۔ خاموشی ہر طرف محو گفتگو تھی۔ چاندنی میں ساتھ بیٹھے وہ نور کے کوئی مجسمے لگے تھے۔ وقت نے دونوں کو دیکھا۔ دل دونوں کے بے ترتیب تھے۔ کچھ کہتے ہوئے، کچھ محسوس کرتے ہوئے کچھ ملکیت کا احساس کرتے ہوئے۔ کچھ شکر گزاری کرتے ہوئے۔

The moon beautiful is n't it

گل شاد حسین نے چہرہ غزل کی جانب موڑتے ہوئے سرگوشی میں کہا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ اس کا مطلب نہیں سمجھ پائے گی لیکن چاندی میں بیٹھی سرخ جوڑے والی لڑکی کے گال اس کی بات پر لال ہوئے، مسکراہٹ گہری ہوئی، آنکھوں میں چمک بڑھی۔

Yes it is

اور اس نے بھی دھیرے سے سرگوشی کی۔ وقت تھما، چاند چمکا، چڑیا چہچہائی۔ وہ چڑیا جو رات کے وقت اکثر اسی طرح چہچہاتی تھی۔ زندگی میں پہلی دفعہ گل شاد حسین کو ایسا انمول حسن

دیکھنے کو ملا تھا، حسن جو ڈھانپا گیا ہو۔

''غزل؟'' اس نے پکارا۔

''ہوں۔'' اس نے رخ موڑا۔

''شہریار! تُو بتا رہا تھا اس گاؤں میں کوئی بھی لڑکی پانچویں سے زیادہ نہیں پڑھی ہوئی پھر تمہیں انگریزی کیسے آتی ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ غزل میر پر اسراریت سے مسکرائی۔

''مجھے تو انگریزی نہیں آتی اور اردو بھی بس تھوڑی بہت بول لیتی ہوں۔'' غزل نے پوری سچائی سے جواب دیا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بات کر رہی تھی۔ زبان سے زیادہ اس کی سنہری آنکھیں باتیں کر رہی تھیں۔ ہاتھ بھی محوِ گفتگو تھے۔

''لیکن تم اس دن بھی بول رہی تھی ناں آج بھی۔'' وہ ہنوز الجھن میں تھا۔

''بتاؤں؟'' معصومیت سے، شرارت سے مسکراتے ہوئے غزل نے کہا۔

''بتاؤ......'' وہ اس کے انداز پر مسکرا دیا۔

''بتاتی ہوں، بلکہ رکیں، دکھاتی ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر تیزی سے گھر کی جانب چلی گئی۔ چند منٹوں بعد اس کی واپسی ایک ہاتھ میں پکڑے لالٹین اور دوسرے ہاتھ میں پکڑے ایک صندوقچے سے ہوئی۔ چھوٹا لوہے کا خوبصورت سا ڈبا۔ اپنی جگہ پر آ کر بیٹھی پھر لالٹین بیچ میں تھوڑا اونچے کر کے رکھا۔ ایک بھونرا ڈر کر اچھل کر اڑ گیا۔ پھر اس نے وہ صندوقچہ کھولا۔ اندر بہت سی کاپیاں تھیں۔ ساتھ دو ڈائریاں بھی تھیں۔

''تم میں یہ شوق بھی ہے؟'' وہ ڈائریوں کو دیکھ کر بولا۔ غزل نے سر اوپر نیچے ہلایا چہرہ چمک رہا تھا۔ اس کی قربت میں کچھ زیادہ ہی چمک رہا تھا۔

”آپ کو پتا ہے غزل میر کو سب سے زیادہ کس چیز کا شوق ہے؟“ اس نے چہرہ اٹھائے بغیر پوچھا۔

”دنیا گھومنے کا؟“ چند پل سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ زیادہ لوگوں کا تو یہی ہوتا ہے۔

”اونہوں! وہ بھی ہے لیکن زیادہ نہیں ہے۔ مجھے زبانیں سیکھنے کا شوق ہے۔ میں چاہتی ہوں مجھے ہر زبان پر عبور حاصل ہو۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ لہجے میں جوش سا تھا۔

”یہاں سیاح آتے ہیں ناں شروع سے تو جب میں چھوٹی تھی تو انہیں گائیڈ کرتی تھی۔ کچھ سیاح پاکستان سے ہوتے کچھ باہر کے ممالک سے۔ وہ جو لفظ بولتے، الفاظ اپنی گفتگو میں استعمال کرتے مجھے جو جو اچھے لگتے میں وہ میں کاپیوں پر لکھ لیتی۔“ اس نے ایک کاپی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس نے وہ کھولی۔ بے شک غزل میر کی لکھائی بہت خوبصورت تھی۔ چھوٹے چھوٹے لفظ پر بے حد خوبصورت۔ اس میں رومن انگلش لکھی تھی کہیں تو کہیں صحیح انگلش، ساتھ مطلب بھی لکھے تھے۔ یکے بعد دیگرے اس نے ساری کاپیاں سرسری سی دیکھیں۔

”اور ان دو ڈائریوں میں کیا ہے؟“ ڈائریوں کو دیکھ کر گل شاد حسین نے پوچھا۔ غزل نے ڈائریاں اسے نہیں دی تھیں۔

”یہ میں نے نو سال کی عمر سے لکھنا شروع کی تھیں۔ اس والی ڈائری میں میرا بچپن، میرا لڑکپن اور میری جوانی ہے مطلب زندگی کے چوبیس سال۔“ اس نے سیاہ جلد والی ڈائری اسے دکھائی، پھر خاموش ہو گئی۔

”اور اس والی ڈائری میں؟“ گل شاد حسین نے سرخ رنگ کی جلد والی ڈائری کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اس سرخ جلد والی ڈائری میں غزل میر اور گل شاد حسین کی داستان ہے۔'' اس بار چہرہ گل شاد حسین کی طرف نہیں موڑا تھا۔ وہ واپس لوہے کا بنا چھوٹا سا ڈبا بند کر رہی تھی۔ چہرے پر حیا کی لالی تھی۔ وہ مبہوت سا اسے دیکھے گیا۔

جب اچھا وقت ہو تو زندگی میں وقت کی قدر نہیں ہوتی۔ وہ قلیل تر لگتا ہے لیکن مشکلات میں یہی وقت عذاب لگتا ہے۔ ایسے ہی پھر وقت گزرتا گیا۔ وہ پندرہ دن انہوں نے کشمیر کے بہت سے مقامات دیکھتے گزارے۔ پھر اس کے بعد کئی زمانے گزرتے گئے۔ ان کی محبت بڑھتی گئی۔ ہر تیسرے مہینے چند دنوں کے لیے گل شاد حسین کشمیر آتا اور ان دنوں کا اسے شدت سے انتظار ہوتا۔

گل شاد حسین اور غزل میر جواب غزل گل شاد حسین تھی، نے کشمیر کے پہاڑوں پر کئی موسم ساتھ دیکھے تھے۔ انہوں نے بہار کی آمد کو ساتھ خوش آمدید کہا تھا۔ انہوں نے گرمیوں میں کشمیر کے پہاڑوں کی بارش میں ساتھ بھیگا تھا، پت جھڑ کے موسم میں ایک دوسرے کے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھامے رکھا تھا، سردیوں میں پہاڑوں پر پڑتی برف کو ساتھ محسوس کیا تھا۔ وہ سال کے چاروں حصوں میں مختلف وقت میں ساتھ رہے تھے اور اپنے نشان پہاڑوں پر ساتھ چھوڑے تھے۔ یہ دو سال ان کی زندگی کے بہترین سال تھے۔ اسے فوج میں ترقی نہ ہوئی لیکن زندگی میں غزل میر کے سنگ بہت سی خوشیاں اسے ملیں۔

والدین شادی کے لیے دباؤ بڑھاتے رہے۔ وہ پریشان ہوتا، فکر مند ہوتا اور پھر پہاڑوں میں چلا آتا۔ جہاں غزل کے سنگ ہر پریشانی اسے بھول جاتی۔

غزل میر کی موجودگی میں اسے جو واحد شے یاد رہتی تھی وہ غزل میر تھی اور اس سے کی

جانے والی بے پناہ محبت۔

کشمیر کے پہاڑوں نے ان دونوں کی داستان کو محسوس کیا تھا۔ وہ زندگی کے دوسرے مرحلے کو پار کر رہے تھے۔ خوشی سے، سرشاری سے، شکرگزاری سے۔

☆......☆......☆

گل شاد حسین نے اپنی داستان روک دی۔ پارک کے اس حصے میں جہاں بہت سے افراد چہل قدمی کر رہے تھے چلتے ہوئے کسی کو محسوس بھی نہ ہوا کہ وہ دونوں کشمیر کے پہاڑوں کی ابھی کچھ دیر میں سیر کر آئے ہیں۔ عیسیٰ نے رخ موڑ کے انہیں دیکھا۔ آنکھوں میں نمی اور چہرے پر مسکراہٹ لیے وہ جیسے ابھی بھی پہاڑوں میں موجود تھے۔ پھر ہاتھ میں بندھی گھڑی کی طرف دیکھا جہاں نو بجنے والے تھے۔

''تو بالآخر گل شاد حسین نے اپنی چاہت حاصل کر ہی لی؟'' عیسیٰ نے ان سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ انہوں نے رخ موڑ کے اسے دیکھا۔

''محبت کے تین مرحلے ہوتے ہیں۔'' وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے گئے۔ عیسیٰ ان کے ہم قدم ہوا۔

''پہلا محبت کا ہو جانا۔ وہ لمحہ جب آپ پر ادراک ہو کہ آپ محبت میں مبتلا ہیں۔ میری داستان میں، میں نے یہ مرحلہ تمہیں کل سنایا تھا۔'' انہوں نے رخ موڑ کے اسے دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''محبت کا دوسرا مرحلہ ہوتا ہے۔ محبت کا حصول۔ وہ وقت جب محبت آپ کے حصار میں ہو۔ آپ محبت حاصل کر چکے ہوں۔ محبوب کی موجودگی آپ کے اردگرد ہر چیز پر بھاری ہو۔ محبت کا یہ مرحلہ میں نے آج تمہاری سماعت تک پہنچایا۔''

انہوں نے رخ نہیں موڑا لیکن عیسٰی نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ ان دوادوار میں کون سا دور انہیں پسند تھا؟ یا زیادہ پسند تھا؟ لیکن عیسٰی ان کا جواب جانتا تھا اور عیسٰی خود بھی اسی پر یقین رکھتا تھا۔ نکاح کے بعد والی محبت۔

''محبت کا تیسرا مرحلہ جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟'' انہوں نے دور خلا میں گھورتے ہوئے پوچھا۔ عیسٰی رک گیا تھا جب کہ وہ چلتے رہے۔

''محبت کا تیسرا مرحلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اور بہت کم لوگ اس مرحلے کو پار کرتے ہیں۔ محبت کا یہ مرحلہ بہت کٹھن ہوتا ہے۔'' وہ رکے نہیں کہہ کر چلتے گئے۔

''کل میں صبح آؤں گا۔ صبح نو بجے۔'' انہوں نے بناء رکے کہا اور آگے بڑھ گئے۔ عیسٰی انہیں جاتا دیکھتا رہا پھر گہری سانس لے کر اپنی بائیک کی طرف آ گیا۔

مگر آج سارا راستہ اس نے گل شاد حسین کی داستان کو سوچتے نہیں گزاری تھی۔ آج اس نے اپنی داستان پر غور کرنا چاہا تھا۔ آج عیسٰی زبیر خود پر غور کرنا چاہ رہا تھا۔ آج وہ لمحہ پھر سے یاد آیا تھا جب جسم میں پہلی مرتبہ دلِ زار کا احساس ابھرا تھا۔ جو ہر چیز کو خاکستر کر گیا تھا۔

☆......☆......☆

رات تقریباً دس بجے وہ اپنے کمرے میں واپس آیا تھا۔ کھڑکی کے سامنے کھڑا وہ موبائل پر نمبر ملا رہا تھا پھر کانوں سے لگایا۔ دائیں ہاتھ میں موبائل تھا جو اب کانوں سے لگا تھا جبکہ بایاں ہاتھ جینز کی جیب میں۔ نظریں اس کی کھڑکی سے باہر تھیں۔ جہاں اس وقت کچھ لوگ نیچے سڑک پہ چہل قدمی کر رہے تھے، کچھ اپنے گھر کی گیلری اور ٹیرس پر تھے تو کچھ گھروں کے اندر۔ ہنستے مسکراتے، خوش، ناخوش۔ دوسری طرف کال لگ گئی تھی، گھنٹی جا رہی تھی پر کال اٹھائی نہ گئی تھی۔ رنگ ٹون کے بجائے کوئی شاعری سنائی دیتی تھی۔

کوئی تم سے پوچھے کون ہوں میں
تم کہہ دینا کوئی خاص نہیں
اک دوست ہے کچا پکا سا
اک جھوٹ ہے آدھا سچا سا
اک پھول ہے روکھا سوکھا سا
اک سپنا ہے بن سوچا سا
اک اپنا ہے ان دیکھا سا
اک رشتہ ہے انجانا سا
حقیقت میں افسانہ سا
کچھ پاگل سا دیوانہ سا
بس اک بہانا اچھا سا

دوسری طرف سے فون نہیں اٹھایا گیا پر عیسیٰ زبیر سب کچھ بھلائے نظم کو سن رہا تھا۔ وہ اس کے مصرعوں میں کہیں گم تھا۔ اسے لگا یہ نظم عیسیٰ زبیر پر لکھی گئی ہے۔ کوئی اور شے عیسیٰ زبیر کو ایسے بیان نہیں کرسکتی تھی۔ کسی بھی رشتے میں اس کا کردار ہمیشہ سے ایسا ہی تھا آٹے میں نمک جیسا جو نظر نہ آتا تھا لیکن آٹے کو ذائقے دار بناتا تھا۔ پر یہ تو السا نور نے اپنے فون پر لگائی تھی۔ کیا وہ بھی اس جیسی تھی۔ بہت پہلے اس نے اللہ سے کہا تھا اسے اپنی جیسے عورت چاہیے تھی بہت سال بعد اسے پتا لگا تھا وہ جو اس کی پسلی کا گمشدہ حصہ تھی بالکل اس جیسی تھی۔ وہ دونوں بے حد مختلف ہونے کے باوجود ایک جیسے تھے، ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے تھے۔

''جیون کا ایسا ساتھی ہے

جو دور ہو تو کچھ بھی پاس نہیں

کوئی تم سے پوچھے کون ہوں میں

تم کہہ دینا کوئی خاص نہیں"

دوسری طرف پھر سے بیل جا رہی تھی عیسیٰ نے اس کے آخری فقرے سنے۔ دو سال بعد اسے سمجھ آ گئی تھی کہ السانور ہزار اس سے مختلف ہونے کے باوجود اس جیسی تھی، اسی کے لیے بنی تھی اور اسی کے لیے لکھی گئی تھی۔ نظم رک چکی تھی دوسری طرف سے کال اٹھا لی گئی تھی۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ آج کچھ قصے تھے جنہیں تمام ہونا تھا، کچھ غلط فہمیاں تھیں جنہیں ڈھلنا تھا، کچھ الجھنیں تھیں جنہیں سلجھنا تھا۔

☆......☆......☆

رات کے دس بجے تقریباً اپنا سارا کام ختم کر کے وہ باورچی خانے کی راہداری کے دوسرے کونے میں بیٹھی "الف" پڑھ رہی تھی۔ طواف عشق کے بارے میں اپنے خیالات اس نے صبح ہی پوسٹ کر دیئے تھے۔ دل دیا دہلیز کا تبصرہ ابھی پوسٹ کرنا تھا۔ وہ کتابیں پڑھتی تھی اور انسٹاگرام پر اس کے تبصرے کرتی تھی۔ انسٹاگرام نے جتنا اس کا ذہنی توازن سدھارا تھا اس سے کہیں زیادہ بگاڑا تھا۔ انسٹاگرام اب وہ انسٹاگرام نہیں رہا تھا جو دو ہزار اٹھارہ، انیس اور بیس میں ہوا کرتا تھا۔ کتابوں کے بارے میں اپنی رائے دینے کا خیال اسے چند اردو کے بکسٹاگرامرز کو دیکھ کر آیا تھا۔ انسٹاگرام پر یہ رجحان (اردو ناولز اور کتابوں کو اجاگر کرنے کا) انہی کی وجہ سے آیا تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے بڑھتا گیا۔ اگر اسے کسی کتاب کے بارے میں اپنی پسند ناپسند بتانی پڑتی تو اس کے جواب میں بعض لوگوں کی فضولیات بھی سننی پڑتیں۔ بعض لوگ اس کی رائے کو قبول کرتے، اور پھر اپنی رائے دیتے عزت سے احترام سے لیکن بعض لوگ تو

گالیوں پر اتر آتے۔ یہ چیز اس کی ذہنی صحت کو برباد کر کے رکھ دیتی تھی لیکن اپنے لیے یہ چیز تو اس نے خود چنی تھی اس لیے برداشت کرتی اور غلاظت بھرے لوگوں کو بلاک کر دیتی۔ (ویسے بلاک لسٹ اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ شاید ہر لڑکی کی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے اندر موجود لوگ اتنے ہی ناپسند ہوتے ہیں وہ الگ بات ہے۔) وہ اپنی پسند ناپسند بتاتی تھی۔ اس میں لکھاری پر کبھی تنقید نہ کرتی، اگر کرتی بھی تو تنقید برائے اصلاح۔ دوسرے کی رائے اگر اس سے مختلف ہوتی تو وہ اسے بھی خوبصورتی کے ساتھ تسلیم کرتی تھی۔ جیسے اس کا ٹیسٹ مختلف تھا دوسروں کا بھی ہو سکتا تھا۔

ادب عالیہ اور پاپولر فکشن وہ دونوں پڑھتی تھی۔ وہ اس وقت بھی آرام سے بیٹھی کافی کا کپ قریب رکھے کتاب میں محو تھی۔ اسے سیاہ کافی پسند تھی حد سے زیادہ۔ امی کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ تو باہر کی روشنی اندر نہ جاتی تھی۔ اس بیچ انس ایک بار آ کر اپنے لیے میگی بنا کر لے گیا تھا۔ موبائل آج بھی پاس رکھا تھا۔ آج اسے پتا تھا کوئی پیغام آ بھی نہیں سکتا آج تو وہ خود آیا تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے چند ثانیے کو نظر فون پر دوڑائی۔ اوپر کونے پر بنی گھنٹی پر کراس کا نشان تھا۔ کچھ دیر وہ کتاب میں مصروف رہی۔ وہ کہانی کے آخر پر تھی جہاں قلب مومن مومنہ سلطان کو پھول دیتا ہے۔ اور اسے بتاتا ہے کہ سفید گلاب اس پر کیسا لگتا ہے، اس کے گال سرخ ہو رہے تھے۔ مسکراتے ہوئے اس نے کتاب پر سے چہرہ اٹھایا چند لمحے خود کے سامنے بنی الماریوں کو دیکھا۔ خود کو چند لمحے کسی سین کو ہضم کرنے کے لیے دینا اس کی عادت تھی۔ عمیرہ احمد کے الفاظ انسان پر جیسے سحر کر دیا کرتے ہیں۔ مدھم، سادہ اور خوبصورت الفاظ میں کہی جانے والی بے حد آسان بات بعض دفعہ بہت خاص ہو جاتی تھی۔ یہی ان کی لکھائی کی خاص بات تھی۔ (عمیرہ احمد کا رائٹنگ سٹائل السا نور کو پسند تھا۔ ٹاپ پر نہیں تھا لیکن تھا۔ وہ

اس قدر خوبصورت اور انمول الفاظ لکھتی تھیں کہ بندہ خود کو کسی سحر میں محسوس کرتا۔ اسے جو سب سے زیادہ پسند تھا وہ سمیرا حمید کا لکھنے کا طریقہ تھا۔ کس قدر خوبصورت نثر ہوتی تھی ان کی۔ شاعرانہ انداز سے وہ نثر لکھتی تھیں۔) اس نے مسکراتے ہوئے ویسے ہی نظر موبائل کی طرف پھیری تو اپنی جگہ ساکت ہوئی۔ مسکراہٹ ویسے ہی رہی آنکھیں ساکت رہیں۔ لمحے بھر کو دل بھی تھما۔ پورے دو سال اور نو ماہ بعد ”E“ کے نام سے اس کے موبائل پر کال آ رہی تھی۔ وہ پیغام جس کا اس نے صدیوں انتظار کیا تھا وہ آج جب آیا تھا تو الساء نور کو خود کا دل ساکت ہوتا محسوس ہوا۔

آج ہی تو وہ یہاں سے گیا تھا۔ پھر دل ذرا سنبھلا اس نے فون اٹھایا، کتاب گود میں ہی تھی، ٹانگیں لمبی کیے کتاب پڑھ رہی تھی اب جوڑ دی تھیں۔ اس نے یس کا بٹن دبایا۔

☆......☆......☆

”السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟“ عیسٰی نے چند ثانیے بعد پوچھا۔ الساء نور نے ہمیشہ پُرسکون اور نرم رہنے والی آواز کو خود پر سحر کرتے محسوس کیا۔ وہ بولتا تھا اور دنیا فتح کر لیتا تھا۔ وہ بولتا تھا تو رک کر، ٹھہر کر سننے کا دل چاہتا تھا۔

”وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟“ اس نے بھی پوچھا، آنکھیں بند تھیں چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ عیسٰی نے آسمان کی جانب دیکھا۔

”میں گہری نیند سے جاگا ہوں الساء نور۔“ آج اس نے الحمدللہ نہیں کہا تھا۔ دوسری طرف الساء نے اس کا الحمدللہ بہت بے چینی سے مس کیا تھا۔ وہ پہلی بار اس کا نام لے رہا تھا۔ وہ پہلی بار اسے اس کے نام سے پکار رہا تھا۔ الساء نور نے اپنی سماعتوں میں نرم گرم سی پھوار اترتی محسوس کی۔ مون سون کی پہلی بارش جیسی۔ سردیوں کی آمد بتانے والی بارش جیسی۔

''مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے ہمارے متعلق۔عیسیٰ زبیر اور الساء نور کے متعلق۔'' عیسیٰ نے کہا تو الساء چونکی، پھر الجھی۔ پھر یہ لمحے یہیں ساکت ہوئے اور فضا کہیں پیچھے کسی ماضی کے اوراق میں جاتی محسوس ہوئی۔کسی راز پر سے پردہ اٹھانے۔

☆......☆......☆

وہ دن خوشگوار تھا۔سردیوں کی برفیلی صبح پورے مری کو یخ بنارہی تھی۔ وہیں اسلام آباد اور راولپنڈی کو بھی جمارہی تھی۔ جمعہ کی نماز سے پہلے کا وقت تھا جب مرد سارے صدر کی جامع مسجد میں جمع تھے اور ساری لڑکیاں گھر پر۔

پہلے مسجد میں نکاح ہوا جس میں عیسیٰ زبیر نے دل و جان سے الساء نور کو اپنی زوجیت میں لیا تھا۔ یہ رشتہ گھر والوں کی پسند کا تھا لیکن عیسیٰ کو کوئی مسئلہ نہ تھا۔ پھر صدر کے اس چھوٹی پر پُرسکون راہداری والے گھر میں الساء نور سے پوچھا گیا تو الساء نور نے عیسیٰ زبیر کو خود کا وجود سونپ دیا۔ نکاح کے بعد مرد بھی سارے گھر چلے آئے، زیادہ لوگ نہ تھے بس اپنے اپنے تھے۔ پھر چھوارے بانٹے گئے۔ چھوارے ایسے ریپر کے اندر تھے جس کے باہر عیسیٰ زبیر اور الساء نور لکھا تھا۔ چھوارے اور مٹھائی کے بعد کھانا کھایا گیا۔ مرد کم رہ گئے تھے جو تھے مہمانوں کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ابھی دونوں کی فوٹوز ساتھ کھینچی جانی تھیں۔عیسیٰ نے میز کی جانب دیکھا جہاں جگ تو تھا پانی نہیں تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنا ہر کام خود کرنے کی عادت نے اسے کسی سے پانی مانگ کر پانی پینے کی اجازت نہ دی۔ وہ چھوٹا سا صحن پار کر کے باورچی خانے میں آ گیا۔ زینوں کے پاس والا باتھ روم وہاں نہیں تھا تب۔ یہ جگہ کھلی کھلی سی تھی۔

باورچی خانے کے ساتھ والے کمرے کا ذرا سا دروازہ کھلا تھا۔ وہ فلٹر سے پانی بھرنے کے لیے نیچے بیٹھا۔ تو اس کی سماعتوں سے آواز ٹکرائی۔

''مان لو یہ بات الساء نور عیسیٰ زبیر نائل سے زیادہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔'' اسے کسی کی سنجیدگی بھری آواز سنائی دی۔ عیسیٰ کا پورا وجود ساکت ہوا۔

''وہ دھوکے باز شخص تھا اور بے وفا بھی۔ وہ مرد کہلانے کے لائق نہیں تھا۔ اور جو تھا وہ دیکھو کیسے اللہ نے تمہیں سونپ دیا۔'' پھر سے آواز آئی۔ آواز دھیمی تھی پر اسے سنائی دی۔ عیسیٰ زبیر کا گلاس پکڑا ہاتھ کانپا۔

''اب تم پوری مخلصی کے ساتھ یہ رشتہ نبھانا۔ یہ شخص بہترین ہوگا تمہارے لیے۔'' کوئی دوسری آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا، پانی پیئے بغیر۔ اس کی پیاس بجھ چکی تھی۔

''بے شک آپ کے نصیب میں جو لکھا ہوتا ہے آپ کو وہی ملتا ہے۔'' اسے آواز سنائی دی۔ وہ جانتا تھا یہ آواز الساء نور کی تھی۔ وہ پہلے جب رشتے کے لیے اس گھر میں آیا تھا اس کی آواز سن چکا تھا۔ واپس باہر جاتے ہوئے جو آخری بات اس کے کانوں میں پڑی تھی وہ کسی اور لڑکی کی تھی۔

''تمہیں پتا ہے نائل نے نہ اسلام آباد میں ہی رشتہ......'' آوازیں بند ہوگئیں۔ پھر اسے کوئی آواز نہ سنائی دی اسے کچھ محسوس نہ ہوا۔ اس کے بعد فوٹو شوٹ بھی ہوا۔ بس قدرتی مسکراہٹ کی جگہ عیسیٰ کے چہرے نے مصنوعی مسکراہٹ سجالی۔ اس نے کبھی کسی کو اس بارے میں نہیں بتایا۔ عیسیٰ زبیر نے نہ دوستوں سے اس بات کا ذکر کیا نہ ہی کسی گھر کے فرد سے۔ وہ نارمل رہا تھا وہ الساء کے ساتھ بھی اسی احترام اور نرم مزاجی سے بات کرتا رہا تھا۔

جس واحد ہستی سے اس نے شکوہ کیا تھا وہ خدا کی ذات تھی۔ اگلی تہجد میں وہ خدا کے سامنے بیٹھا زاروقطار رو رہا تھا۔ منہ سے کچھ نہ بولتے پر قلب میں اس سے ہم کلام ہوتے ہوئے۔

اس نے ساری زندگی اپنے آپ کو ہر بری شے سے بچا کر رکھا تھا۔ نفس کو خود پر حاوی نہ

ہونے دیا۔ نفس کو اپنے قابو میں رکھا۔ شاید لڑکیوں کے لیے یہ اتنی مشکل بات نہیں ہوتی لیکن مرد جو گھر، معاشرہ دونوں کا حصہ ہوتا ہے۔ جو باہر نکلتا ہے جو دنیا گھومتا ہے، ان کے لیے خود کو بچا کر رکھنا اپنے نفس کو کبھی اپنا آقا نہ بنانا خود اس کا غلام نہ بننا بہت مشکل ہوتا ہے۔

وہ تو نظریں جھکا لیا کرتا تھا کسی صنفِ نازک کو دیکھ کر، وہ تو بہت احتیاط اور نرمی برتتا۔ شیطان نے کئی بار لڑکیوں کو ورغلایا اور وہ اپنے نفس کے ہاتھوں اس کے پاس آئیں، اس سے دوستی کرنے، اس سے بات کرنے، وہ ہر کسی کو نرمی سے رد کر دیا کرتا تھا، نظرانداز کر دیا کرتا تھا، اپنا راستہ بدل لیا کرتا تھا۔

عیسیٰ زبیر نے ساری زندگی خود کو پاک رکھا تھا ساری زندگی خود کی نظروں کی حفاظت کی تھی پھر کیسے اسے ایسی عورت دی گئی جس کا وقت کسی اور کے لیے صرف ہوا ہو۔ اس نے السّاء نور کو نہ ہی دھوکے باز سمجھا نہ بدکردار نہ کچھ اور۔ آج کے دور میں ان چیزوں سے بچنا بہت کٹھن تھا، اسے یہ معلوم تھا۔ اسے بس خدا کی ذات سے شکوہ تھا کہ اسے اس جیسی عورت سے کیوں نہیں نوازا گیا؟ عیسیٰ کا دل اس رشتے کو قبول کرنے سے جھجکتا رہا۔ دو سال اسی میں گزر گئے۔ دل کو سمجھانے میں پر وہ نہ سمجھتا تھا۔ وہ رشتہ ختم نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی بہت سی وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ وہ طلاق کو شدید ناپسند کرتا تھا کیونکہ طلاق اس کے رب کو ناپسند تھی۔ پھر دوسری وجہ وہ اپنی ماں کو دکھی نہیں دیکھ سکتا تھا جنہوں نے بڑے مان سے اپنے لیے بہو اور بیٹے کے لیے بیوی لائی تھی۔ اور تیسری وجہ السّاء نور تھی۔ وہ کیسے کسی کی بیٹی کو، کسی کی بہن کو معاشرے کے سوالوں کے لیے چھوڑ دیتا۔ پر وہ ہنوز اسی کشمکش میں تھا، دل میں ایسی اذیت ہوتی جو بیان نہیں کی جا سکتی تھی۔ شادی کے بعد بھی وہ خود کو سمجھا نہیں پایا تھا۔ شادی والی رات وہ بے حد اذیت میں تھا۔ وہ ایک لڑکی کو دھوکہ نہیں دے سکتا تھا لڑکی بھی وہ جو اس کی بیوی تھی۔

اس نے پھر کچھ وقت مزید لینے کا سوچا۔ اس نے احترام اور نرمی سے السّاء سے گزارش کی تھی جسے دوسری طرف سے رد نہیں کیا گیا۔ کچھ مزید پوچھا بھی نہیں گیا۔ عیسیٰ نے لمحے بھر کو سوچا کیا واقعی وہ بھی یہی چاہتی ہے، اس رشتے کو وقت دینا تاکہ اپنا ماضی بھلا سکے۔ یا پھر وہ اسے دل سے قبول ہی نہ کر پائی ہے۔ لیکن لمحے میں اس نے تعوذ کا ورد کیا اور شیطانی واہمے غائب ہو گئے۔

وہ دونوں ایک کمرے میں رہتے تھے۔ بیڈ کے دونوں کونے ان دونوں کے نام تھے۔ وہ ہمیشہ اس سے نرمی سے بات کرتا۔ اپنے کام وہ خود کرنے کا عادی تھا۔ تو جب شروع شروع میں السّاء نے کرنا چاہے تو اس نے اسے منع کر دیا۔ پھر بھی وہ ہلکا پھلکا اس کا کام کر دیتی تھی۔ وہ دونوں خاموش طبع تھے۔ عیسیٰ زیادہ تھا جب کہ السّاء کم۔ لیکن اس کی باوجود کمرے میں ہوتے تو السّاء کسی کتاب کا مطالعہ کر رہی ہوتی تو عیسیٰ قرآن پڑھ رہا ہوتا یا پھر کوئی اسلامی کتاب۔ اس کے پاس بہت کم کتابیں تھیں لیکن تھیں بہرحال۔ لیکن وہ اسلام کے متعلق ہی تھیں۔ اسے کتابوں کا زیادہ شوق نہ تھا۔ لیکن چونکہ اسلامی معلومات کے لیے اسے پڑھنی پڑتیں اس لیے تھوڑا بہت حدیث کی کتابیں، قصص الانبیاء اور دوسری تاریخ اسلام وغیرہ کی کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ چند دن بعد السّاء کی امی کی طبیعت خراب ہونے پر وہ اپنے میکے چلی آئی تھی۔ عیسیٰ کو اس کی عادت زیادہ نہیں ہوئی لیکن اکثر اسے بیڈ پر بیٹھی یا بالکونی میں بیٹھی اپنی کتابوں میں محو وہ یاد آجاتی، صبح ناشتے پر بھائی کے ساتھ بیٹھی بھابھی کو دیکھ کر بھی۔

یہ کہہ کر عیسیٰ لمحے بھر کو رکا۔ السّاء کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

”پھر مجھے خدا کی طرف سے ایک انسان ملا۔ ایسا انسان جب وہ محبت کے دوسرے مرحلے میں تھا تو اس نے مجھے بتایا کہ جو آپ سے جڑ گیا ہے اس کے حال اور مستقبل سے آپ

کا تعلق ہے اس کے ماضی کا آپ سے کوئی لینا دینا نہیں۔ تب مجھے احساس ہوا۔ الساء نور پہلے کیا تھی کیا فرق پڑتا ہے الساء نور عیسیٰ زبیر کے نام سے جڑنے کے بعد کیا ہے یہ بات اہم ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

وہ اب کھڑا نہیں تھا رخ کمرے کی جانب موڑ کے وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ٹانگے لمبی کیے وہ جیسے سکون چاہتا تھا۔

"میں چاہتا تو آپ کو نہیں بتاتا آپ کا راز خود تک رکھتا اور آپ سے اپنے تعلقات بہتر کر لیتا، پھر میں نے سوچا کہیں آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں کسی اور کی محبت میں گرفتار ہوں، یا پھر آپ کی ذات میرے لیے اہمیت نہیں رکھتی۔ یا پھر میں بیوی کو خود سے کم تر سمجھتا ہوں۔ آپ کا نام میرے نام سے جڑنے کے بعد آپ غیر نہیں رہیں، میرے لیے بے حد اہم ہیں۔"

اس نے وہ بتایا جو سچ تھا، جو اس کے دل میں تھا۔ پھر دونوں جانب خاموشی چھا گئی۔ وہ الساء نور کے بولنے کا منتظر تھا۔ پر دوسری طرف خاموشی تھی۔ عیسیٰ زبیر کو یکدم احساس ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔ وہ کیسے بھول سکتا تھا وہ لڑکی ہے اور اس کے پاس جو چیز ہمہ وقت موجود رہتی ہے وہ آنسو ہیں۔ دکھ ہے تو آنسو بہا لیے خوشی ہے تو آنسو۔ بیزاری ہے تو آنسو الجھن ہے تو آنسو۔ آنسو، آنسو، آنسو۔

"آپ روئیں مت الساء نور۔ عیسیٰ زبیر کسی کو آنسو تو نہیں دیتا۔" اس نے کہا تھا بے حد رنجیدگی سے۔ الساء نے خاموشی سے اپنا چہرہ صاف کیا۔

"میں نے دو سال، نو ماہ اور اٹھارہ دن پہلے جب نکاح نامے پر دستخط کیے تھے اس وقت خود کے جذبات سے لے کر خود اپنے آپ تک ہر شے عیسیٰ زبیر کو سونپ دی تھی۔" الساء نے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے۔ عیسیٰ نے لب وا کیے، وہ کہنا چاہتا تھا آپ صفائی مت

دیں بھلا میں کون ہوتا ہوں آپ سے صفائی مانگنے والا۔ پر اسے کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ یہ بھی کہنا چاہتا تھا اسے کبھی یہ خیال نہیں گزرا کہ السماء اس سے بیوفائی کر سکتی ہے اس کی بیوی اس کے ساتھ مخلص نہیں ہے۔

''السماء نور آپ کے ساتھ تعلق جڑنے کے بعد مخلص رہی ہے ہمیشہ۔ اس کی وفاداری کا گواہ خود عیسیٰ زبیر کا اللہ ہے۔'' کہتے ساتھ اس نے کال کٹ کر دی۔ عیسیٰ نے پھر سے کال نہیں کی، فون زمین پر رکھ دیا۔ وہ ویسے ہی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھا رہا۔ اسے پتا تھا یہ دلِ زار کی آخری رات ہے۔ اگلی صبح دل مرمت کے مرحلے سے گزر گیا ہو گا۔ اور واقعی اگلی صبح تہجد میں قرآن پڑھتے ہوئے اس کا دل بے پناہ ہلکا تھا۔ حد سے زیادہ۔

☆......☆......☆

السماء بے اختیار دیوار سے ٹیک لگائے سسکتی گئی۔ چشمے جو ہاتھوں میں تھے پھسل کر پاس زمین پر گر پڑے۔ وہ ایسی نہ تھی کبھی بھی۔ وہ اس سے مختلف تھی۔ دین کے قریب بھی نہ تھی۔ وہ تو ضدی تھی ہٹ دھرم بھی۔ ہر شے میں اپنی کرنے والی۔ پھر اس کی زندگی میں نائل آیا۔ وہ اسے بہت چاہنے لگی تھی۔ نائل سے گفتگو میں پہل اس نے کی تھی۔ محبت کا اظہار نائل کی طرف سے تھا لیکن عورت کا زوال تو اسی دن شروع ہو جاتا ہے جس دن وہ محبت میں پہل کرے، جس دن مردوں کی طرف خود سے گفتگو کا آغاز کرے۔ ایسی گفتگو جس میں اس کا دل شامل ہو۔

جب شادی کی بات آئی تو پہلے دونوں کے گھر والے نہ مانے۔ پر السماء نے اپنے ابو کو منا لیا۔ مشکل تھا نا ممکن نہیں۔ وہ لڑکی جو نماز تک صرف رمضان میں پڑھتی تھی اور اکثر وہ بھی قضا ہو جاتی تہجد پڑھنے لگی تھی۔ ہر نماز میں دعائیں، وظائف کیا کچھ نہیں چھوڑا تھا اس نے ایک

شخص کو پانے کے لیے۔ اور پھر دونوں کے گھر والے مان گئے، نائل کی امی نیم رضا مند تھیں لیکن پھر پتا نہیں کیا ہوا نائل نے شادی سے منع کر دیا۔ کیوں؟ اس کا جواب اس نے نہیں دیا۔ وہ اسے کہتا تھا کہ خدا کی طرف سے اس کے لیے بہترین لکھا ہوگا۔ تم آگے بڑھ جاؤ یہ اور وہ......لیکن کیا زندگی میں آگے بڑھنا اتنا آسان ہوتا ہے کہ کوئی آپ کو کہے اور آپ موو آن کر جاؤ؟ وہ اذیت بھرے دن تھے، اگر خود کو مصروف نہ کر لیتی تو الساء نور آج تک کسی پاگل خانے میں ہوتی۔ کبھی کبھار الساء سوچتی کہ آخر اس کی دعاؤں میں کہاں کمی تھی۔ اس کے ایسے کون سے سجدے میں فرق تھا کہ اسے وہ شخص نہیں ملا۔ لیکن الساء نور کو کون بتاتا کہ ہو سکتا ہے اس کی طرف سے واقعی کوئی کمی نہ ہو لیکن دوسری طرف سے کوشش ہی نہ کی گئی ہو۔ اور پھر انسان تو اپنے مستقبل سے لاعلم ہوتا ہے، پھر وہ کیوں ایسے راستوں کی طرف قدم بڑھاتا ہے جہاں آگے منزل ہے یا کھائی اسے نہیں پتا ہوتا۔

پھر آہستہ آہستہ وہ اس کے دل سے نکلتا گیا۔ کیا یہ آسان تھا؟ یہ آسان نہیں تھا، یہ بالکل بھی آسان نہیں تھا۔ کئی سال لگے تھے، کئی صدیاں لگی تھیں۔ اس کی بیوفائی کے بعد بھی اس سے نفرت نہیں ہو پائی ہاں البتہ اب فرق نہیں پڑتا تھا۔ کبھی کبھار دل لپکتا ماضی کی طرف لیکن وہ دل کو سمجھا لیتی۔ نفرت نہیں تھی تو محبت بھی نہیں رہی تھی۔ پھر جب اس کا رشتہ عیسیٰ زبیر سے ہوا تب بھی وہ مطمئن تھی۔ لیکن دل جسے بہت بار سنبھالا تھا وہ ہر وقت چاہتا تھا کہ ماضی میں قید رہا جائے۔ وہ کبھی کبھی اسے اسٹوک (stalk) کرنے لگتی، کبھی اس کے بارے میں کچھ پتا لگتا تو وہ پریشان ہو جاتی۔ دل ہر چیز سے اکتا جاتا۔ لیکن وہ بھول گئی تھی یہ تو شیطان کی چالیں ہیں۔ شیطان تو اسے پھر سے امید اور نا امیدی کے بیچ جھلا رہا ہے، لیکن یہ ساری چیزیں نکاح سے پہلے تک کی تھیں۔ جس دن عیسیٰ زبیر سے اس کا نکاح تھا اس سے پچھلی رات وہ آخری تھی

جب اس نے اس بیوفا شخص کو یاد کیا تھا۔ وہ اس کے دیئے گئے تحفوں کو جلا رہی تھی، پھینک رہی تھی۔ وہ اب ردی کے سوا کچھ نہ تھے۔ موبائل سے اس کا نمبر، میسجز، تصاویر ہر ایک چیز اس نے مٹا ڈالی تھی۔ وہ آخری رات تھی جب وہ اس شخص کے لیے روئی تھی جس سے کبھی اسے محبت رہی تھی اب تو خیر فرق بھی نہ پڑتا تھا۔ عیسیٰ زبیر سے نکاح کے بعد اس نے کبھی اس شخص کے بارے میں نہیں سوچا، جب سوچ آتی وہ تعوذ پڑھ لیتی اور جان بوجھ کر اپنی سوچ اپنے شوہر کی طرف لگا دیتی۔

عیسیٰ زبیر کا اس سے گریز کی وجہ جان کر اسے بس اتنی تکلیف ہوئی تھی کہ وہ سوچتی تھی شادی سے پہلے ایسے فضول لغویات پالنا بعد میں کس قدر اذیت دیتا ہے۔ وہ مرد تھا جب اسے پتا چلا تھا کہ اس کی بیوی پہلے کسی اور سے محبت کر چکی ہے، وہ اسے چھوڑ سکتا تھا یا پھر بعد میں اس سے باز پرس کر سکتا تھا، لیکن وہ واقعی مرد تھا۔ کس قدر اس کے لہجے میں نرمی اور احترام ہوا کرتا تھا کہ الساء نور کو اپنا آپ معتبر لگنے لگتا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے تھے پر دونوں ایک دوسرے کو کمفرٹ دینے کی کوشش کرتے تھے۔

یہ شادی کے نئے نئے دنوں کی بات تھی جب ایک دوپہر باورچی خانے کا کیبن ٹھیک کرتے ہوئے ہتھوڑی عیسیٰ کے ہاتھ سے گری اور اس کے پاؤں میں جا لگی تھی۔ پورا ناخن جلد سے الگ ہو گیا تھا جس سے خون نکلنے لگا۔ اس دوپہر سب گھر میں تھے۔ وہ تینوں بھی باورچی خانے میں تھیں۔ ایک دم ہڑبڑا کر وہ تینوں اس کی طرف مڑیں۔

"کیا ہوا عیسیٰ؟" ماما نے گھبرا کر پوچھا۔ الساء کی اس کے پاؤں پر نظر پڑتے ہی وہ باہر سے فرسٹ ایڈ باکس لانے گئی۔ وہ اسی کرسی میں بیٹھا پاؤں اوپر کیے اس کا جائزہ لے رہا تھا، ہونٹ آپس میں سختی سے پیوست تھے جیسے ضبط کر رہا ہو۔ ناخن بری طرح اکھڑ گیا تھا۔

''کچھ نہیں ہوا، بس تھوڑا سا ناخن اکھڑ گیا ہے۔'' پھر اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ باقی خواتین کو کہا تھا۔ جیسے انہیں پریشان نہ کرنا چاہتا ہو۔

''اونہوں مجھے دے دیں میں کرلوں گا خود۔'' وہ جو اس کے پیروں کے پاس بیٹھنے والی تھی عیسیٰ نے منع کیا، پر وہ بنا سنے وہیں نیچے بیٹھ گئی۔ عیسیٰ کے پیروں کے پاس اور پھر زخم کا معائنہ کرنے لگی۔ پہلے ناخن کٹر سے اکھڑا ہوا ناخن کاٹا پھر پٹی کی۔ عیسیٰ منع کرتا رہا تھا، اسے اس کا یوں زمین پر بیٹھنا اچھا نہیں لگا تھا، وہ بھی عیسیٰ زبیر کے کسی کام کے لیے۔

لیکن اس دن اس کے پاس بیٹھتے الساء نور کو پتا تھا وہ اس رشتے سے ایک چیز ختم کر چکی ہے۔ وہ ان دونوں کے درمیان میں آڑے آنے والی انا کو پیروں تلے روند چکی ہے۔ اس نے اپنے شوہر کی تکلیف کو کم کرنے کے لیے خود کی انا کی قربانی دی تھی۔ اسے برا نہیں لگا تھا اور نہ ہی شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔ حالانکہ ان کی شادی نئی نئی تھی۔ الساء نور کو پتا تھا زندگی میں کئی پہر ایسے آئیں گے جب وہ یوں اس کی تکلیف کم کرنے کی کوشش کرے گی۔ اور صرف یہ اس کی طرف سے تو نہیں ہوتا تھا عیسیٰ زبیر نے بھی تو کئی مرتبہ ایسے ہی اس رشتے کے تقاضے نبھائے تھے۔ وہ ہمیشہ بلب بجھا کر زیرو کا بلب جلائے نماز پڑھنے کا عادی تھا۔ جب بھی گھر نماز پڑھتا اس کا یہی معمول ہوتا تھا۔

اس دن وہ بیڈ پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی جب وہ اندر آیا تھا۔ اسے تو احساس نہ ہوا لیکن جلتے بلب میں اسے نماز شروع کرتے دیکھ کر بے اختیار اسے یاد آیا اور ڈھیروں غصہ بھی آیا خود پر۔

''مجھے یاد نہیں رہا۔ آپ بلب بجھا دیتے نماز سے پہلے۔'' وہ سلام پھیر چکا تھا جب اسے الساء کی آواز آئی۔ وہ مسکرا دیا۔

''کوئی بات نہیں، آپ کتاب پڑھ رہی تھیں تو میں نے سوچا میں اسی طرح نماز پڑھ

لوں۔'' وہ اس کی طرف رخ موڑ کے بولا۔
''میری وجہ سے۔'' السا ء نے کچھ کہنا چاہا تھا۔
''کسی بھی رشتے میں سب سے پہلے ختم جو چیز کی جاتی ہے وہ اپنی انا ہوتی ہے، اور خودی بھی۔ مجھے نیم اندھیرے میں نماز پڑھنا اچھا لگتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں دوسروں کو اپنی وجہ سے اندھیرے میں کردوں۔'' وہ اب مڑ کر تسبیح کررہا تھا۔ السا ء نور نے اس کی پشت دیکھی۔
''ایک بات پوچھوں؟'' اس نے جانے کن سوچوں میں سوال کیا تھا۔
''جی پوچھیے؟'' اس نے ایک بار رخ پھر اس کی جانب موڑا۔ وہ ہمیشہ ایسا کرتا تھا جب بھی کوئی اسے پکارتا یا بات کرتا، خاص کر بھابھی، ماما اور اب السا ء، وہ ساری توجہ ان کی طرف کردیتا۔ یہ اپنے گھر کی خواتین کے لیے اس کی طرف سے دی جانے والی اہمیت ہوتی تھی۔
''محبت اور عزت نفس کا آپس میں گہرا تعلق ہے، کیا یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ رہ سکتی ہیں؟ کیا ان دونوں شے کا ساتھ رہنا ممکن ہے؟'' السا ء نے یہ سوال پوچھا تھا اور اس کا جواب نہ کی صورت میں تھا، اسے یہ بات پتا تھی۔ ساری کتابیں یہی کہتی تھیں، سارے فلسفے یہی تھے کہ عزتِ نفس اور محبت دونوں ساتھ نہیں رہ سکتیں، لیکن عیسیٰ زبیر کے جواب نے جیسے اسے حیران کیا تھا۔
''کوئی بھی رشتہ ہو، کسی بھی قسم کا ہو عزتِ نفس اور خودداری ہر تعلق میں ہوتی ہے اور ہونی چاہیے۔ رشتوں میں انا ختم کی جاتی ہے اور خودی بھی قربان کرتے ہیں لیکن عزتِ نفس اور خودداری کو برقرار رکھتے ہیں۔ محبت کا بھی ایسا ہی ہے۔ جب آپ اگلے انسان کے لیے اپنی عزتِ نفس اور خودداری ختم کردیتے ہیں تو سامنے والے شخص کو انسان نہیں رہنے دیتے، خدا بنا

دیتے ہیں، اور پھر اسے پوجنا شروع کر دیتے ہیں۔'' عیسیٰ زبیر سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

''انسان کو انسان رہنے دینا چاہیے۔ کیونکہ انسان ہوتا ہی وہی ہے جو انسان رہتا ہے۔ جو آدم رہتا ہے۔ وہ شیطان نہیں بنتا وہ خدا نہیں بن سکتا۔'' اس نے کہتے ساتھ ایک بار پھر رخ موڑا تھا۔

وہ اس لمحے سے نکل کر واپس حال میں آئی تھی۔ عیسیٰ زبیر ٹھیک کہتا تھا۔ اس نے ایک شخص کو چاہا اور پھر خود کے نفس کو مٹا دیا۔ اور وہ خدا بن بیٹھا۔ لیکن انسان کو تو انسان رہنا چاہیے تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے فون کو دیکھا۔ اس میں نوٹیفکیشن آیا تھا۔ اس نے بے اختیار وہ ایپ کھولا۔

''یقیناً تیرے لیے انجام آغاز سے بہتر ہوگا۔''

وہ آیت...... وہ آیت نہیں تھی مرہم تھا جو دل پر لگا تھا۔ (یہ اسلام 360 ایپ تھا۔ جسے کھولتے ساتھ کوئی بھی آیت سامنے آجاتی ہے۔ اس ایپ کے بارے میں اسے رب سے جڑنے کا سفر بقلم ام ہریرہ ناول پڑھنے پر پتا چلا تھا۔) ابھی جیسے خدا نے اسے بتایا تھا کہ تکلیفوں کا وقت ختم ہوگیا، یا ہو جائے گا۔ اسے جیسے آخرت کی نوید سنائی گئی تھی یا اسی زندگی میں اپنے اس مرحلے کی۔ اسے کہیں دور سے عیسیٰ زبیر کی آواز کانوں میں ڈھلتی محسوس ہوئی۔ وہ جو دھیما مگر خوبصورت بولتا تھا۔

''کوئی بھی شے ہمیں ایسے ہیل نہیں کرتی جیسے قرآن کرتا ہے۔ قرآن ہمارے باطن، ہمارے ظاہر، ہمارے دل اور ہمارے دماغ ہر چیز کو ہیل کرتا ہے پھر ہمیں کسی اور مرمت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ پھر کوئی اور چیز ہمیں ہیل کر بھی نہیں سکتی۔'' وہ بے اختیار مسکرا دی۔ آنسوؤں سے بھری آنکھوں والی مسکراہٹ۔ اسے پتا تھا کل کی صبح ایک خوشگوار صبح ہوگی۔

اسے جلال انصر ضرور دیا گیا تھا لیکن وہ وقتی تھا اسے سالار سکندر ہی ملنا تھا۔ ہاں وہ

سارے کردار فکشن تھے لیکن الساء نور اور عیسیٰ زبیر تو حقیقی کردار تھے ناں۔ جو بے حد مختلف ہو کر بھی ایک جیسے تھے۔ جنہیں سب سے زیادہ خدا اور اس کا دین پسند تھا۔ جنہیں بلیاں پسند تھیں اور جنہیں خاموشی پسند تھی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے مسکرا دی۔ پر آنسو پھر بھی بہے جا رہے تھے۔ وہ اس قدر خود میں مگن تھی کہ کمرے سے نکل کر باورچی خانے میں آتے انس نے رک کر اسے دیکھا، یہ بھی وہ جان نہ پائی۔ وہ باورچی خانے کے بجائے اس کی طرف چلا آیا۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اس نے اپنی بہن کو دیکھا۔ جس کی گود میں ناول پڑا تھا۔ ایک تو پتا نہیں ان لڑکیوں کو ناولز میں کیا اچھا لگتا ہے؟

''تم پھر کسی کردار کے مرنے پر رو رہی ہو؟'' انس کی آواز سے وہ بے اختیار چونکی پھر رخ موڑ کے اسے دیکھا۔ وہ بے حد تاسف سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''ضروری نہیں ہر بار ہم ناولز کے کرداروں کے لیے ہی روئیں۔ بعض دفعہ اصل زندگی کے کردار بھی ہمارے رونے کی وجہ بن جاتے ہیں۔ اور یہ زیادہ تکلیف دہ بات ہے۔'' چہرہ ہاتھوں کی پشت سے صاف کرتے ہوئے وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

''اونہوں۔ کچھ نہیں ہو سکتا تمہارا۔'' وہ نفی میں سر ہلاتا واپس باورچی خانے کی طرف جانے لگا۔

''انس؟'' الساء نور نے پکارا۔ وہ بے اختیار رکا۔ پھر اسے دیکھا۔

''تمہیں پتا ہے میری زندگی میں تین مرحلے آئے ہیں خود کی پہچان کے۔ پہلا مرحلہ وہ جو بچپن سے جوانی تک کا تھا۔ جس میں الساء نور ''میں ہی ہوں'' کی سوچ پر زندگی گزارا کرتی تھی۔ اس میں انا شامل تھی۔ پھر دوسرا مرحلہ نائل کی آمد پر آیا۔ تب میری سوچ۔ ''میں بھی ہوں'' پر ٹک گئی، اس دور میں میرے اندر احساس کمتری نے ڈیرا ڈال دیا تھا۔ تیسرے مرحلے

پر اب میں ہوں۔ جو مجھے اللہ اور اللہ کے بعد عیسیٰ زبیر کے ملنے پر حاصل ہوا۔ وہ مرحلہ ''میں ہوں'' ہے۔ اس میں عزتِ نفس ہے۔ اس میں خودداری ہے، لیکن اس میں عاجزی بھی ہے۔'' وہ کھوئی کھوئی سی زمین کو دیکھے کہے جا رہی تھی۔ انس خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھے گیا۔

''ہمیں ''میں ہی ہوں'' کو چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ اس سے غرور جھلکتا ہے، تکبر گھیرتا ہے۔ ہمیں ''میں بھی ہوں'' کو بھی چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ اس سے ہماری احساسِ کمتری اور مظلومیت ظاہر ہوتی ہے۔ ہمیں ''میں ہوں'' کو زندگی کے ہر پہر، ہر پہلو میں سب سے اوپر رکھنا چاہیے کیونکہ اس سے ہماری ذات نظر آتی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ہاں دنیا میں عزتِ نفس اور خودداری جیسی شے بھی ہے۔ جو اپنا وجود رکھتی ہے۔ جو انسان کو انسان رہنے دیتی ہے۔'' کسی اور زمانے میں کھوئے اس نے جیسے زندگی کے اتنے سال سیکھنے والی بات لمحے میں کہہ دی تھی۔ چشمہ اٹھائے چہرے پر ٹھیک سے لگایا۔

''تم نے دوائی نہیں لی آج اپنی؟'' انس نے ہمدردی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ السّاء نور نے ناسمجھی سے نظریں اس کی جانب اٹھائیں۔ پھر اس کی آنکھوں میں ناچتی شرارت کو دیکھا۔ شدت سے اُسے غصہ آیا، پاس پڑی کتاب اٹھائی۔

''انس، ذلیل انسان۔'' وہ جیسے ہی اسے مارنے کو اٹھی وہ باورچی خانے کا ارادہ ملتوی کیے کمرے کی جانب بھاگا۔

''صبح امی کو کہوں گا السّاء نور کا اب دوائیوں سے کچھ نہیں ہونے والا، اسے پاگل خانے کی ضرورت ہے۔'' کمرے کے اندر داخل ہونے سے پہلے انس نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ السّاء چند لمحے تو اسے منہ ہی منہ میں غصے سے کچھ سناتی رہی پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اگر آپ کے پاس بہن بھائی ہوں تو غم زیادہ دیر نہیں ٹک سکتے آپ

کے پاس۔ زندگی کی واٹ لگی ہوتی ہے لیکن بہن بھائیوں نے اپنا الگ سرکس بنایا ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

انیس ستمبر کی صبح بے حد حبس بھری تھی۔ دھوپ شدت سے پڑ رہی تھی، ایسا لگتا تھا جون جولائی پھر سے لوٹ آیا ہو۔ وہ صبح نو بجے ایوب پارک چلا آیا تھا۔ رات کے بعد سے دوبارہ اس کی السماء سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ آہستہ سے چلتا ہوا اس حصے میں آیا جہاں جھیل تھی۔ یہ مصنوعی جھیل تھی جس کے کنارے پر اس وقت وہ کھڑا پانی میں جھانک رہا تھا۔ زرد پتے نیچے بکھرے تھے۔ دائیں جانب گل شاد حسین بھی اسی کی نظروں کے تعاقب میں دیکھ رہے تھے۔ آج وہ خاموش تھے بہت، جانے کیوں؟

''آج کشمیر کے پہاڑوں کا سفر نہیں کرنا؟'' عیسیٰ زبیر نے رخ موڑ کے انہیں دیکھا۔ جنگلے پر ہاتھ رکھے وہ گہری سوچ میں گم تھے۔ آج وہ شلوار قمیض میں ملبوس تھے۔ جس کا رنگ آسمان کے رنگ سے ملتا تھا۔

''میں بارہ بجے کی بس سے کشمیر جا رہا ہوں۔'' انہوں نے نظریں اٹھائیں نہ چہرے کے تاثرات بدلے۔ عیسیٰ نے خاموشی سے انہیں دیکھا۔

''آج ہمارے نکاح کی سالگرہ ہے۔ انیس ستمبر کو گل شاد حسین اور غزل کا نکاح ہوا تھا۔'' انہوں نے پھر کہا، گہری سانس لی اور اس کی طرف رخ موڑا۔ پھر وہیں جنگلے سے ٹیک لگائے نیچے بیٹھ گئے۔ چند لوگوں نے حیرت سے انہیں دیکھا پر وہ متوجہ نہیں تھے۔ عیسیٰ زبیر نے بھی ان کے ساتھ والی جگہ سنبھالی۔ جب سے غزل میر کے لیے انہوں نے زمین پر بیٹھنا شروع کیا تھا اس کے بعد سے انہیں زمین پر بیٹھنا کبھی مشکل نہ لگا تھا۔

☆......☆......☆

اچھا وقت جتنا زیادہ ہو، اتنا ہی قلیل لگتا ہے۔ گل شاد حسین کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اس کے ماں باپ اس کی شادی پر بہت زور دینے لگے تھے۔ وہ تیس سے اوپر ہونے والا تھا، ماں باپ کو اس کی فکر تھی۔ وہ چھٹیوں پر اس بار گھر آیا تو محمد حسین کی طبیعت ناساز تھی۔ انہیں ذیابیطس کا مسئلہ تھا اس بار کچھ زیادہ ہی ہائی ہو گئی تھی۔ انہوں نے اس کی شادی پر مزید زور دینا شروع کر دیا۔

''میں اس لڑکی کے سوا کسی سے شادی نہیں کروں گا۔'' اس نے ان کے نڈھال چہرے سے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا جب محمد حسین نے کہا تھا وہ اب اس کی خوشیاں دیکھ کر سکون سے اس فانی دنیا سے کوچ کرنا چاہتے ہیں۔

''تم خاندان کے باہر شادی کرنا چاہتے ہو ہمیں یہ بات منظور ہے گل شاد۔'' وہ نقاہت زدہ لہجے میں کہہ رہے تھے۔

''مجھے ذات سے باہر شادی کرنی ہے۔ ابا کیا ہو جائے گا ذات سے باہر شادی کرنے سے؟'' وہ ایک بار پھر انہیں سمجھانے لگا تھا۔

''مجھے کشمیر جانا ہے آج کی ٹکٹ ہی لے لو۔'' انہوں نے اس کی بات کو نظر انداز کیے کہا۔ مزید کچھ بولنے سے بھی روکا۔ گل شاد حسین کا ماتھا ٹھنکا۔

''کیوں؟ کشمیر کیوں؟'' اس نے بے اختیار پوچھا۔

''کیوں سے کیا مطلب؟ اب کیا بوڑھے ماں باپ کو کشمیر لے جانے میں بھی تمہیں تکلیف ہو رہی ہے؟'' انہوں نے نظریں اٹھائے اسے دیکھا۔ گل شاد حسین باہر نکل گیا جبکہ محمد حسین کسی گہری سوچ میں گم تھے۔

☆......☆......☆

اوائل دسمبر کے دن کشمیر میں بے حد خنک بھرے ہوتے تھے۔ برف باری، بارشیں اور ٹھنڈ دسمبر میں اپنے زوروں پر تھا سب کچھ۔ لیکن اس دن بے حد خوبصورت دھوپ نکلی تھی۔ پچھلا پورا ہفتہ برف باری رہی تھی، لیکن دو دنوں میں اچھی دھوپ سے برف کا نام ونشان بھی مٹ گیا تھا۔ بس پہاڑ سفید روئی کے گالوں جیسے تھے۔ سنگترے چھیل کر کھاتے گل شاد حسین کی نظر دور کھڑے چند لڑکوں پر پڑی۔

آج بازئی (عقیقہ) تھا۔ شہریار کے بھتیجے کا، تو سارا گاؤں اکٹھا تھا پر وہ بغیر کسی دلچسپی کے الگ تھلگ سا بیٹھا تھا۔ شہریار سے اس کی آخری ملاقات چھے ماہ پہلے ہوئی تھی۔ تین ماہ پہلے وہ باہر گیا تھا جب اس کی ملاقات نہ ہو سکی تھی۔

''یار فوجی! ایک سگریٹ دے ناں۔ ختم ہے اور میں آج بازار جا نہیں سکا۔'' اس کا کوئی کزن اس کے پاس کھڑا کہہ رہا تھا۔

''میرے پاس نہیں ہے، میں اب سگریٹ نہیں پیتا۔'' اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

''بس کر دے یار، مجھے پتا ہے تمہارا۔'' وہ ہنس کر بولا تھا جب کہ گل شاد حسین ماضی کے کسی لمحے میں کھو گیا تھا۔

''تم مجھے سگریٹ پینے سے کیوں منع نہیں کرتی حالانکہ محبوبہ ہو یا بیوی سب سے پہلے شوہر سے اپنی اسی سوکن کو دور کرتی ہے۔'' وہ نیلم گھومنے گئے تھے جب گل شاد حسین کو سگریٹ کی طلب ہوئی تھی۔ وہ عموماً اس کے سامنے پینے سے گریز کرتا تھا۔ بہت کم ایسا ہوا تھا کہ اس نے غزل کے پاس سگریٹ نوشی کی ہو۔ کیونکہ سگریٹ اور لڑکی کی دشمنی سے وہ واقف تھا۔ اور خوب واقف تھا۔

''آپ میرے کہنے پر چھوڑ سکتے ہیں یہ پینا؟'' غزل نے سادگی سے سگریٹ کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''تم جو کہو تو جان تم پر وار دوں پھر یہ سگریٹ کیا چیز ہے۔'' اس نے سگریٹ جلاتے ہوئے بے حد مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ پہلے بھی مسکراتا تھا اب یہ مسکراہٹ چہرے سے جدا نہیں ہوتی تھی فرق صرف یہ پڑا تھا۔

''چند سالوں کے اس تعلق میں اتنی طاقت آ گئی کہ آپ اسے میرے کہنے پر چھوڑ دیں گے لیکن وہ جو صدیوں سے اس عورت سے تعلق ہے لیکن اس کے کہنے پر نہیں چھوڑیں گے؟ اسے میں کیا نام دوں؟'' غزل نے اب کی بار اسے نہیں دیکھا، وہ دور بھاگتے ہوئے گھوڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی گھڑسواری کی خواہش گل شاد حسین نے پوری کردی تھی۔ یہ اعزاز بھی اسی انسان کے نام جس کے نام غزل میر تھی۔ جس کے نام غزل میر کی محبت تھی۔

گل شاد حسین جو ہنستے ہوئے سگریٹ لبوں سے لگانے لگا تھا ٹھٹکا، جھجکا پھر رکا۔

''ہم پر سب سے زیادہ ہماری ماں کا حق ہوتا ہے۔ آپ نے جب ان کے کہنے پر سگریٹ نہیں چھوڑی تو میں آپ کو یہ چھوڑنے پر مجبور نہیں کروں گی، کیونکہ میں نہیں چاہتی یہ اعزاز میرے نام ہو۔ کچھ چیزیں آپ کو صرف ماں باپ کے لیے کرنی چاہئیں۔ کچھ قربانیاں صرف ماں باپ کے لیے ہوتی ہیں۔ اور انہیں کے لیے دینی چاہئیں۔ میں ہماری اعلانیہ شادی کے بعد جہاں رہوں گی آپ کے ماں باپ میرے ساتھ رہیں گے۔ اس ایک غلطی کی سزا ان کی ساری زندگی کی خدمت ہوگی۔'' وہ اب مزید کچھ بولے بنا آگے بڑھ گئی تھی۔ چہرے پر افسردگی تھی، رنج تھا۔ گل شاد حسین کو اپنی پسند پر ایک مرتبہ پھر فخر ہوا۔

منظر ہوا میں کہیں گم ہوا، نیا منظر آنکھوں کے سامنے آیا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا جب اس کی ماں اندر آئی تھی۔

''جان چھوڑ دو اس زہر کی گل شاد۔ یہ کتنا نقصان دہ ہے تمہیں پتا ہے؟'' وہ خفگی سے بولتی ہوئی آئیں اور اس کے ہاتھ سے سگریٹ لیا۔ اب انہیں یاد بھی نہیں تھا یہ جملہ انہوں نے کتنی بار کہا تھا۔ لیکن گل شاد حسین کو لگا یہ پہلی بار ہے۔ اس نے ان کے چہرے کو دیکھا۔ مائیں کیوں ایسی ہوتی ہیں؟ سب سے الگ، سب سے نایاب، سب سے مہربان۔

''آپ کہتی ہیں تو چھوڑ دیتا ہوں۔ ابھی اس وقت سے چھوڑ دیتا ہوں۔ دوبارہ کبھی سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔'' وہ ان کی طرف دیکھتے مسکرایا۔

''کتنے وقت کے لیے؟'' انہوں نے تنگ آ کر پوچھا۔

''ساری زندگی کے لیے، ہمیشہ کے لیے۔'' وہ ہنس پڑا۔ وہ ہنستے ہوئے اچھا لگتا تھا۔ بہت اچھا۔ اور پھر گل شاد حسین نے دوبارہ اس زہر کو کبھی چھونے کی جسارت نہیں کی۔

''فوجی ماموں! کیا میں آپ کے پاس بیٹھ جاؤں؟'' وہ جو ماضی کے کسی لمحے میں تھا کسی بچے کی آواز پر چونکا، رخ موڑ کے دیکھا یہ اس کی پھوپی زاد کا نو سال کا بیٹا تھا۔ اس کا وہ کزن جو سگریٹ مانگ رہا تھا اب وہاں نہیں تھا۔

''کیوں نہیں میتی بیٹھو۔'' گل شاد حسین نے اس سے کہا۔ وہ بیٹھ گیا پتھر پر پھر پلیٹ میں سے سنگترے لے کر کھانے لگا۔

''ہاں بھئی مہتاب میاں، سکول جاتے ہو؟'' وہ گول مٹول سا بچہ تھا۔ اپنے مرحوم باپ پر تھا۔

''ہاں جاتا ہوں لیکن شبو نہیں جاتا۔'' اس نے اپنے بھائی کی شکایت لگائی۔ گل شاد حسین کا دماغ ارد گرد کی سوچوں سے نکل چکا تھا۔ بچوں کے ساتھ بتائے چند پل خود کی ساری الجھنوں سے یکسر غافل کر دیتے ہیں۔

''کیوں بھائی شہاب کیوں نہیں جاتا؟'' اس نے پوری پلیٹ اٹھا کر اسے دے دی وہ مسکرا دیا۔

''وہ اماں سے کہتا ہے میں واپس اپنے گھر جاؤں گا پھر ہی جاؤں گا سکول ورنہ نہیں۔'' اس نے جلدی سے وجہ بتائی۔ وہ کشمیری زبان میں بات کر رہے تھے۔ اس دور میں مظفر آباد میں پہاڑی سے زیادہ کشمیری زبان بولی جاتی تھی۔

''میتی! تم یہاں بیٹھو ہو، کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔'' گل شاد کے کچھ کہنے سے پہلے ہی مہتاب کی ماں خفگی سے بولتی ان کے قریب آ گئی۔

''کیسی ہیں نگہت آپا؟ اور میتی کو میں نے روک دیا تھا۔'' وہ رخ موڑ کے ان کی طرف دیکھ کر بولا۔ دبلی پتلی سی نگہت گل شاد حسین سے سات آٹھ سال بڑی تھی، لیکن دو بچوں کی پیدائش اور پھر شوہر کے مرنے کے بعد میکے میں رہنے کے بعد سے مزید بڑی اور بوڑھی لگنے لگی تھی۔

''کیسے ہو فوجی؟ ٹھیک ہو ناں؟'' وہ پاس آئیں پھر مہتاب کو گھورا اور اس سے بھی حال احوال پوچھا۔ یہ بڑی انوکھی چیز ہوتی ہے بعض لوگوں کی آپ ان سے خیریت پوچھ رہے ہوتے ہیں اور وہ بنا جواب دیے واپس آپ سے۔

''میں ٹھیک ہوں مزے میں ہوں۔'' وہ خوشگواریت سے بولا۔ دھوپ پُرسکون تھی۔ کشمیر میں سردیوں کی دھوپ کا کوئی مقابلہ نہیں ہوتا۔

''بس بھئی مزے ختم ہونے والے ہیں۔ آج ماموں کریں گے بات رات بڑے ماموں سے پھر تمہاری آزادی کے دن بھی ختم۔'' وہ وہیں پتھر پر بیٹھتے ہوئے بولیں تو گل شاد حسین بے اختیار چونکا۔ اسے پہلے ہی اپنے ابا کے خیالات ٹھیک نہیں لگتے تھے۔

''ہیں۔کیا مطلب؟'' اس نے پوچھا۔دھوپ میں جیسے کہیں سے سردسی ہوا آملی ہو۔

''کیا مطلب سے تمہارا کیا مطلب؟ ماموں پچھلی مرتبہ بات کر کے گئے تھے تمہارے اور افریز کے لیے۔اس بار رشتہ پکا سمجھ لو، آج رات ہی بڑے بیٹھیں گے۔'' وہ شرارت سے مسکرائیں۔گل شاد حسین کو لگا کشمیر کے سارے پہاڑ اس پر گر پڑے ہیں۔دماغ ششدر رہوا جہاں وہیں سارا جسم شل۔اور دل بے ساختہ اپنی دھڑکن روک گیا۔دھوپ اب پُر سکون نہیں رہی تھی۔اس کی چھٹی حس صحیح پیغام دے رہی تھی۔اسے پتا تھا ابا کی خاموشی کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلائے گی۔

''اماں شبو پھر شاہ نواز بھائی لوگوں کے ساتھ تھا آج۔'' مہتاب نے سنگترے کھاتے ہوئے بھائی کی شکایت لگائی، تو نگہت اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ان دونوں میں سے کسی نے بھی گل شاد حسین کی اڑی رنگت نہیں دیکھی۔

''کیا کروں اس لڑکے کا؟ نہ پڑھتا ہے نہ کھیتوں میں جاتا ہے۔باپ ہے نہیں کل کو زمانہ بیچ کھائے گا اسے۔'' وہ مہتاب کو لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔چہرے پر ہزار پریشانیاں تھیں۔گل شاد حسین نے ان کی بات غائب دماغی سے سنی تھی۔اس کی نظریں ان دونوں کی پشت پر تھیں پر دماغ کہیں اور تھا۔اسے پتا تھا اب کچھ نہیں ہوسکتا۔شہریار پہلے ہی باہر چلا گیا تھا ورنہ کشمیر میں کیا کھچڑی پک رہی ہے وہ اسے ضرور بتاتا۔چند لمحے سرکے، چند ساعتیں بیتیں، دھوپ ڈھلی، شام مرجھائی، رات گزری، صبح باسی ہوئی اور بالآخر اگلی شام آئی۔

وہ سارے اس وقت محلے کی مسجد میں تھے جو پانچ منٹ کے فاصلے پر تھی۔گل شاد حسین نے سیاہ کپڑے پہن رکھے تھے۔سیاہ ماتم کی علامت نہیں ہوتا لیکن گل شاد حسین کو لگا آج اگر سیاہ پہنا ہے تو ٹھیک پہنا ہے واقعی آج ماتم تھا اس کے لیے۔

دھوپ سے اٹھنے کے بعد وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر چکا تھا۔ مہتاب کو بلا کر اس نے نگہت کو اس گھر بلایا جس گھر میں وہ لوگ ٹھہرے تھے۔ کشمیر میں فی الحال ان کا اپنا گھر نہیں تھا لیکن بنانے کا ارادہ تھا۔ چند منٹوں بعد حیران سی نگہت چلی آئی۔ ماتھے پر ہلکی سی کالک لگی تھی۔ وہ ضرور کوئی کام کر رہی تھی۔

''مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔'' گل شاد حسین برآمدے پر بنے تخت پر بیٹھا تھا جب کہ وہ وہیں برآمدے کے پلر کے پاس کھڑی تھیں جو لکڑی کا تھا۔ مہتاب پھر کہیں کھیلنے چلا گیا تھا۔ نگہت نے اسے دیکھا پھر اثبات میں سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو بتاؤ۔ اور وہ آہستہ آہستہ بتاتا چلا گیا۔ غزل میر کو دیکھنے سے لے کر اس سے شادی تک اور پھر بعد کے عرصے کا وقت۔ وہ حیران سی سنتی گئی۔ سننے سے زیادہ وہ گل شاد حسین کے چہرے پر وہ رنگ دیکھ رہی تھی جو غزل کے ذکر پر آتے تھے۔ آنکھوں کی وہ چمک نگہت کو خیرہ کر رہی تھی جو غزل کے نام سے آتی تھی۔ وہ بیچ میں کچھ نہ بولی۔ نگہت کو وقت نے یہ ہنر سکھا دیا تھا کہ دوسروں کی بات پہلے مکمل سنو پھر کوئی رائے دو۔

''آخر غزل ہی کیوں فوجی؟ غزل میں ایسا کیا خاص ہے؟'' گل شاد کی خاموشی پر نگہت نے حیرانگی سے پوچھا تو فقط اتنا۔

''وہ مسکراتی ہے تو ہنسنے کا دل کرتا ہے۔ وہ بولتی ہے تو سماعتوں کو اس کی آواز بے حد بھلی لگتی ہے۔ وہ خاموش ہوتی ہے تو اس کی خاموشی بھی پرسکون محسوس ہوتی ہے اور وہ میسر ہوتی ہے تو اس کی موجودگی میں باقی ہر شے غیر ضروری لگنے لگتی ہے۔'' گل شاد حسین دور کہیں کسی اور جہاں میں لگتا تھا۔

''میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں اس سب میں؟'' نگہت نے گل شاد حسین کی آنکھوں میں

محبت نہیں دیکھی کیونکہ وہ محبت کے جذبے سے ناآشنا تھی البتہ لہجے پر اعتماد کرنا پڑا۔

''آج نہیں تو کل آپ کی دوسری شادی ہو جائے گی۔ آپ کے دو بیٹے ہیں۔ شہاب پہلے ہی بگڑ چکا ہے۔ مہتاب بھی باپ کے بغیر ساری زندگی محرومی میں گزارے گا۔ میں چاہتا ہوں آپ اور میں اپنی مشکلات ایک ساتھ مل کر حل کریں۔'' وہ اتنا کہنے کے بعد خاموش ہو گیا۔

''وہ کیسے؟'' نگہت نے الجھن سے پوچھا۔ وہ ہنوز نہیں سمجھی تھی۔

''ہم دونوں کو ایک دوسرے سے نکاح کی صورت۔ مجھے شادی کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا مزید اور آپ کو ایک گھر اور آپ کے بیٹوں کو باپ مل جائے گا۔'' اس بار گل شاد حسین نے زمین پر سے نظریں نہیں اٹھائیں۔ شرمندگی تھی یا کیا وہ زمین پر نظریں گاڑے بیٹھا رہا۔

سورج کے غائب ہوتے ہی سردی نے ایسا ڈیرا ڈالا کہ روح کانپ اٹھے۔ نگہت نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ محبت اور پیار کے قصے سنانے کے بعد وہ ایسی بات کر رہا تھا۔ اور کر بھی کس سے رہا تھا؟

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو گل شاد؟ ہوش میں تو ہو ناں؟ آٹھ سال بڑی ہوں تم سے؟ آپا کہتی ہیں تمہارا منہ نہیں تھکتا؟ اور پھر میں اور میرے بیٹے بوجھ تو نہیں ہیں میکے میں بھی میرا حصہ ہے اور سسرال میں میرے بچوں اور شوہر کا حصہ ہے۔'' نگہت نے غصے سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ کہا تھا۔ اسے لگا گل شاد حسین کا دماغ کام کرنا بند کر چکا ہے۔ یا پھر وہ اتنی ارزاں ہے کہ جس کا دل چاہا اسے کچھ بھی کہہ دے...... زندگی میں ہوئے ایک سانحے کے بعد انسان کو ہر طرف مایوسی نظر آتی ہے۔

''لیکن باپ کی کمی کون پوری کرے گا؟ ماموں کتنا دیکھیں گے؟ ٹھیک ہے وہ اپنی طرف

سے سو فیصد کریں لیکن کیا انہیں باپ کی کمی محسوس نہیں ہوگی؟ یا پھر کل جہاں شادی ہوئی آپ کی وہ آپ کے بچوں کو سگے باپ جیسا پیار دے پائے گا۔ جب کہ میں کم از کم یہ وعدہ ضرور کرتا ہوں، انہیں کبھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گا۔ وہ میرے بھانجے نہیں رہیں گے پھر بیٹے بن جائیں گے۔'' گل شاد حسین نے اب کی بار اور پر دیکھتے ہوئے اسے یقین دلانا چاہا۔

یہ سب مشکل تھا۔

''تمہارے لیے غزل کچھ بھی، کبھی بھی۔'' وہ بڑبڑایا۔

''اماں شبو نے منے کو پتھر مارا ہے اس کے سر سے خون نکل رہا ہے۔'' مہتاب ہانپتا کانپتا آیا تھا اور پھر نگہت بھاگتی ہوئی اس کے ساتھ چلی گئی۔ گل شاد حسین نے کچھ نہیں کہا خاموشی سے وہیں بیٹھے انہیں جاتا دیکھتا رہا۔

خاندان کے چند مرد ہی جمع تھے مسجد میں۔ پھر مولوی صاحب نے اس سے نکاح کا پوچھا۔ جو دل پر کئی پتھر رکھ کر اس نے قبول کیا۔ اس سارے وقت میں غزل میر کو اس نے نہیں سوچا تھا۔ وہ سوچنا چاہتا بھی نہیں تھا۔ اسے یاد تھا غزل نے اس سے ایک بار کہا تھا۔

''کبھی اگر آپ کو دوسری شادی کرنا پڑی تو پہلے مجھے بتا دیجیے گا۔'' وہ جنگل میں شام کے وقت سیر کر رہے تھے جب غزل نے کہا تھا۔

''کیوں؟ اور دوسری شادی میں کروں گا ہی کیوں؟ ایک غزل میرے لیے کافی ہے۔'' اس نے حیرانگی سے کہا تھا۔

''آپ کے ماں باپ کی وجہ سے۔ لیکن آپ پہلے مجھے بتائیے گا۔ مجھے دھوکہ مت دینا۔ میں آپ کو بانٹ سکتی ہوں مشکل ہے ناممکن نہیں لیکن بیوفائی برداشت نہیں کر سکتی۔'' وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ گل شاد حسین نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ عورت اپنے مرد کی دوسری

شادی کا ذکر کس اذیت سے کرتی ہے یہ بات کبھی کوئی مرد نہیں سمجھ سکتا۔ اور گل شاد حسین کو غزل میر کی یہ بات یاد تھی۔ اس نے اس ساری گفتگو سے نظر چرائی اور نگہت کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔ گھر میں گل شاد حسین کو نکاح میں لیتے وقت نگہت بے تاثر چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی۔ مہتاب خوش تھا جبکہ شہاب غصے سے کہیں چلا گیا تھا۔☆

شام کو مہتاب کے ذریعے نگہت نے مثبت جواب بھیجا تھا۔ وہ شہاب سے ڈر گئی تھیں۔ وہ نہ تو کسی ماموں کی سنتا تھا اور نہ کسی اور کی۔ اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے انہیں یہ فیصلہ کرنے میں چند منٹ لگے تھے۔

"خاندان کے لیے کچھ بھی، کبھی بھی۔" اپنے بیٹوں کو دیکھتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی تھیں۔ آواز اس قدر ہلکی تھی کہ خود کی سماعتوں کو بھی نہ چھوتی تھی۔ گل شاد حسین اسی وقت اپنے ماں باپ سے بات کرنے گیا تھا لیکن چونکہ محلے کی چند خواتین وہیں بیٹھی تھیں وہ خاموشی سے واپس آنے لگا جب اس کے کانوں میں اپنی ماں کی آواز گونجی۔

"آپ نے غزل کا کہیں رشتہ نہیں طے کیا؟" وہ شاید حُسن جان سے پوچھ رہی تھیں۔ گاؤں کے لوگوں کو اس بات کی بڑی بے چینی ہوتی ہے کہ کوئی شخص بیس سے اوپر چلا گیا اور اس کا کہیں رشتہ نہیں ہوا۔

"وہ، وہ بس جہاں نصیب لکھا ہوگا ہو جائے گا جی۔" وہ گڑبڑائیں، پھر کہتے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ گل شاد حسین کھڑکی سے یہ ساری گفتگو سن رہا تھا۔

"دراصل آپا غزل کا رشتہ چار پانچ سال پہلے میری نند کے دیور کے ساتھ ہوا تھا، لیکن پھر ٹوٹ گیا بلکہ اس نے ہی توڑ دیا۔" یہ اس کی پھوپھو تھیں جو افسوس سے کہہ رہی تھیں۔ گل شاد حسین بھی چونکا۔ اسے نہیں پتا تھا لیکن کیا فرق پڑتا تھا۔ ہزاروں رشتے ہوتے اور ٹوٹتے ہیں۔

جہاں نصیب نہ لکھا ہو وہاں ہزار کوششیں کر لے انسان وہاں سے کچھ نہیں ملتا۔

''کیوں بھلا؟'' اس کی اماں نے پوچھا تھا۔

''کہتا تھا غزل کا قصہ ہر زبان پر ہے۔ غزل غیر مردوں سے ہنس ہنس کر بولتی ہے۔ کیا پتا کسی کے ساتھ چکر ہو؟'' پھوپھو کی آواز بے حد آہستہ ہو گئی تھی۔

''اماں! وہ تھا ہی بے غیرت خود تو شادی سے پہلے بھی دس دس لڑکیوں کے ساتھ اس کا چکر تھا۔ شادی بھی اسی وجہ سے ٹوٹی تھی اس کی۔ لگا ہے غزل کے بارے میں بات کرنے والا۔ غزل کی عادت سے ہم سب واقف ہیں۔ آپ کو پتا ہے وہ کیسی ہے۔ پھول جیسی ہے۔ جب رشتہ ختم ہوا تب بھی کیسے وہ ہنستی مسکراتی پھرتی تھی۔'' یہ نگہت تھی جو مہتاب کو کھانا کھلا رہی تھی۔ ساتھ ناگواری سے بولی۔

''میں نے پوچھا رشتہ ٹوٹنے کا دکھ نہیں ہوا؟ تو کہتی ہے نصیب میں میرے جو چیز نہیں ہے وہ مجھے نہیں ملے گی۔ اور جو چیز میرے نصیب میں ہے وہ لوگوں کے چھیننے سے چھن نہیں جائے گی۔ وہ نصیب پر یقین رکھنے والی لڑکی ہے۔ اور اس کا نصیب واقعی بہت بلند ہے۔'' آخری بات زیر لب کہی تھی۔ نگہت کی غزل کی حمایت نے اس کا درجہ گل شاد حسین کی نظر میں اور بلند کر دیا تھا۔ گل شاد حسین کو یاد تھا۔ غزل میر کا کہنا تھا، ''جو چیز آپ کے نصیب میں ہوتی ہے وہ لوگوں کے چھیننے سے چھن نہیں جاتی۔'' وہ کشمیر کے پہاڑوں میں رہنے والی تھی اور اس کا یقین بھی خدا پر پہاڑوں جتنا تھا۔ اسی شام بڑے سے باورچی خانے میں سب بیٹھے تھے۔ سارے اپنے اپنے وہیں تھے۔

''میں نگہت سے شادی کرنا چاہتا ہوں ابا۔ آپ میرے لیے پھوپھا سے بات کریں۔ اگر خاندان میں شادی کرنی ہے تو میں کہیں اور نہیں کر سکتا۔'' وہ کہتے ساتھ رکا نہیں تھا باورچی

خانے سے کیا گھر سے ہی باہر نکل گیا تھا۔

نکاح کی رسوم کے بعد وہ کتنی ہی دیر خالی ذہن کے ساتھ بیٹھا رہا۔ یہ کیا کر دیا تھا اس نے ؟ یہ کیا کر دیا تھا گل شاد حسین نے خود کے ساتھ؟ غزل میر کے ساتھ؟ وہ جنگل میں چلا گیا۔ وہاں لوگ نہیں تھے خاموشی تھی۔ وہ خاموشی سے بیٹھ کر چند لمحے سوگ کے منانا چاہتا تھا، لیکن اس کے نصیب میں وہ بھی نہیں تھا۔ اسے فوراً واپس جاب پر بلا لیا گیا تھا۔ وہ جو سوچ رہا تھا کل جا کر غزل کو بتائے گا۔ اسے سمجھائے گا اسے موقع ہی نہیں ملا اور وہ واپس شہر چلا گیا۔ نگہت فی الحال وہیں تھی۔ مہتاب کے امتحان کے بعد اس کی رخصتی تھی۔ گھر میں سب کو اس وقت تو صدمہ ہوا تھا لیکن کسی نے کچھ نہیں کہا۔ ویسے بھی عمر کے فرق سے گاؤں میں زیادہ مسئلہ نہیں بنا تھا۔ چھ ماہ ہنگامی حالات کی وجہ سے گل شاد حسین کشمیر نہیں جا پایا، لیکن اس نے کسی سے رابطے کی کوشش بھی نہیں کی۔ نہ ماں باپ سے نہ کسی اور دوست سے، وہ ساری دنیا سے ناراض لگا تھا۔

چھ ماں بعد کشمیر آنے کے بعد وہ سیدھا غزل کے گھر گیا تھا۔ اسے غزل دور سے نظر آئی۔ لیکن قریب پہنچنے پر غزل نظروں کے سامنے سے غائب ہو گئی تھی۔ یوں جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ شاہ میر اور حُسنِ جاں دونوں نے ہمیشہ والی مسکراہٹ کے ساتھ ہی خوش آمدید کہا تھا۔ جب کہ غازان فوج کی ٹریننگ کے لیے گیا تھا۔ شاید غزل کے ماں باپ شروع سے ہی اس قسم کے حالات کے لیے تیار تھے۔ ان کے درمیان اس معاملے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔

''غزل کہاں ہے؟'' گل شاد حسین نے پوچھا۔ لہجے کو نارمل رکھا پر چہرے پر تشویش چھپا نہیں سکا۔

''وہ ابھی یہاں سے جنگل میں بکریوں کو لانے گئی ہے۔ آتی ہو گی۔'' حسنِ جان نے

یکدم کہا۔ وہ لڑکی کی ماں تھیں۔ رشتہ بچانے کی خاطر کچھ بھی کر سکتی تھیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور جنگل کی سمت چل دیا۔ شاہ میر اور حُسنِ جان دونوں نے خاموشی سے اسے جاتا دیکھا تھا۔

وہ دور سے ہی اسے نظر آ گئی تھی۔ جب سے گل شاد حسین سے اس کی شادی ہوئی تھی وہ ہمیشہ اس کے دیئے کپڑے پہنتی تھی۔ خاص کر تب جب گل شاد حسین اس کے پاس ہوتا تھا۔ عرصہ بعد اسے واپس پرانی غزل نظر آئی تھی۔ وہ غزل جو غزل میر ہوا کرتی تھی۔

''السلام علیکم!'' گل شاد حسین قریب چلا آیا۔ دونوں کے بیچ دو تین بکریوں کا فاصلہ تھا دونوں کی نظریں ایک دوسرے پر جمی تھیں۔ وہ آج سبز رنگ کا لباس پہنے ہوئی تھی جب کہ گل شاد حسین نیلے رنگ کے لباس میں ملبوس تھا۔

''وعلیکم السلام۔'' غزل میر نے دھیمے سے جواب دیا۔

''کیسی ہو غزل؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا تھا۔

''میں نے ابھی تک یقین نہیں کیا؟ اور مجھے یقین کرنا بھی نہیں تھا بھلا دنیا کی باتوں پر میں کیوں یقین کروں، ہیں ناں؟'' وہ میکانکی انداز میں بولی تھی۔ گل شاد حسین کی گردن میں گلٹی ڈوب کے ابھری۔

''اگر یقین نہیں کیا تھا تو یہ میرے سامنے پرانی غزل کیوں ہے؟ وہ جو غزل میر ہوا کرتی تھی؟'' گل شاد حسین نے مدھم لہجے میں پوچھا۔ غزل کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا آہستہ آہستہ۔

''تو کیا واقعی؟'' اس نے اتنے دھیمے سے کہا کہ گل شاد حسین نے اس کے لبوں کی حرکت سے بات کا اندازہ لگایا۔

''میں مجبور تھا۔ میں مجبور ہوں۔'' اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ آسمان اب پھر بادلوں کے پیچھے چھپنے لگا تھا۔ بکریاں کب کی گھروں کو لوٹ گئی تھیں۔ ایک بکری جس کی رسی

غزل کے ہاتھوں میں تھی بس وہی کھڑی تھی۔ سفید رنگ کی خوبصورت بکری۔ غزل کے ہاتھوں سے ڈور چھوٹ گئی اور ہاتھ پہلو میں جا گرے۔ بکری بھاگتی ہوئی اپنی راہ ہولی۔

''مرد تو کبھی مجبور نہیں ہوتا۔ جو مرد ایسا کہتا ہے جھوٹ بولتا ہے بکواس کرتا ہے۔'' غزل نے اس بار اس قدر بلند آواز میں کہا کہ سارا جنگل ہل گیا۔

''یہ تم عورتوں کی سوچ ہے ورنہ مرد ہر بار مجبور ہوتا ہے کبھی ماں کے لیے کبھی بہنوں کے لیے، کبھی بیوی کے سامنے تو کبھی بیٹی آڑے آ جاتی ہے۔ مرد انسان ہوتا ہے اور وہ بھی مجبور ہوتا ہے۔'' گل شاد حسین آگے بڑھ آیا۔ غزل کے دونوں ہاتھ تھامے۔

''آپ نے کہا تھا آپ دنیا چھوڑ آئے ہیں۔ میں نے یقین کر لیا تھا۔ میں نے آپ کے لفظ لفظ پر یقین کامل کر لیا تھا۔'' اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ ہوائیں اب تیز ہو رہی تھیں۔ جون آتے ساتھ برسنا چاہتا تھا۔

''میں واقعی دنیا چھوڑ آیا تھا۔ پر وہ میرے ماں باپ تھے انہیں کیسے چھوڑ دیتا؟'' چہرے پر بے پناہ اذیت تھی۔

''سارے جہاں کے سامنے نگہت آپا سے شادی کرنے کا کہا تھا آپ نے۔ ایسی بہادری غزل میر کے وقت کہاں جا سوئی تھی؟'' اس نے ہاتھ چھڑوا دیئے۔ گل شاد حسین نے خاموشی سے اپنے خالی ہاتھوں کو اور پھر اسے دیکھا وہ کمزور ہو گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ آنکھوں کی چمک بھی غائب تھی، چہرہ زرد تھا۔ اپنے مرد کی دوسری شادی کی خبر عورت کا سارا خون نچوڑ دیتی ہے، اسے زندہ لاش بنا دیتی ہے۔

''سب کہتے ہیں پسند کی شادی ہے فوجی کی۔'' وہ پتھر پر بیٹھ گئی۔

''تم کیا کہتی ہو؟'' وہ بھی دوسرے پتھر پر بیٹھ گیا۔ آسمان سفید سے سیاہ بادلوں میں بدل رہا تھا

''اماں، ابا بھی کہتے ہیں کہ ہمیں شروع سے ہی پتا تھا کہ حالات اس رخ ضرور پھریں گے۔'' وہ اب زمین کو دیکھ کر کہہ رہی تھی۔

''تم کیا کہتی ہو غزل؟'' گل شاد حسین نے پھر پوچھا۔

''ابا گئے تھے بازار۔ شہریار بھائی کا فون آیا تھا۔ وہ ابا سے کہہ رہے تھے غزل سے کہنا گل شاد حسین کو غلط مت سمجھنا۔ وہ کسی کنواری اور خوبصورت لڑکی سے بھی شادی کر سکتا تھا لیکن اس نے دو بچوں کی ماں اور خود سے بڑی عورت کو اس لیے چنا کہ ماں باپ شادی پر مزید زور بھی نہ دیں۔ ان بچوں کو بھی گھر مل جائے اور غزل کے ساتھ برا بھی نہ ہو۔'' اس نے چہرہ نہیں اٹھایا۔

''یہ دنیا کہتی ہے۔ غزل میر کیا کہتی ہے؟'' گل شاد حسین نے اس بار چبا چبا کر ایک ایک لفظ ادا کیا تھا۔

''غزل میر کہتی ہے کہ عورت زندگی میں چاہے ہزار غلطیاں کرے لیکن کبھی کسی بزدل مرد سے شادی یا محبت نہ کرے۔ ایسا گناہ نہیں کرے کیونکہ بزدل مرد محافظ نہیں بن سکتا۔'' اس بار چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ آنکھوں میں بے پناہ اذیت تھی۔

''تو تم بتاؤ میں اس وقت کیا کرتا؟ بتاؤ کہ شام میں میرا رشتہ پکا ہو رہا تھا دوسرے دن نکاح ہو رہا تھا۔ میں کیا کرتا بولو؟'' گل شاد حسین کا چہرہ اس بار غصے سے سرخ پڑ رہا تھا۔ وہ تنگ آ گیا تھا۔ ہر چیز سے، خود سے، دنیا سے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''کہہ دیتے میں شادی شدہ ہوں۔ کہہ دیتے آپ کہ میرے نکاح میں پہاڑوں میں بسنے والی غزل میر ہے۔ کہہ دیتے کہ میں محبت میں مبتلا ہوں۔'' وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ آواز اس کی بھی بلند تھی۔

''تو اپنے ماں باپ کو کھو دیتا؟ تم بتاؤ تم کیا کرتی جب محبت اور والدین میں سے کسی ایک

کو چننا پڑتا، بولو تمہارا انتخاب کیا ہوتا؟'' وہ بھی اسی طرح طنزیہ بولا۔ یہ انداز پہلی دفعہ تھا۔ غزل میر نے گل شاد حسین کا یہ انداز پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

''میں؟ خدا کی قسم غزل میر شادی سے پہلے ایسے لغویات ہی نہ پالتی۔ اور اگر پالتی تو ماں باپ کے لیے ہر چیز ترک کر دیتی۔'' وہ بھی بلند آواز میں بولی تھی۔ لہجے میں کوئی رعایت نہ تھی۔ گل شاد حسین نے پہلی مرتبہ غزل میر کو اس لہجے اس انداز میں بات کرتے سنا تھا۔

''تو میں نے غلطی کی تم سے شادی کر کے، تمہارا یہ مطلب ہے؟ میں بھی ان ہزار مردوں کی طرح ہوتا جو تم سے رشتہ جوڑنے کی خواہش لے کر کسی اور کے ہو گئے ہیں۔ یا پھر تم مجھے بھی ان مردوں میں دیکھنا چاہتی تھی؟'' بارش کی ننھی ننھی بوندیں زمین پر گرنے لگی تھیں۔

''کیا ان مردوں کی طرح ہوتا جو تم سے رشتہ اس لیے توڑ دیتے ہیں کہ تم ہر کسی سے کیوں مسکرا کر بات کرتی ہو؟'' گل شاد حسین اس بار اس کا بازو پکڑ کر چلایا تھا۔

''میں نے ہر بات نظر انداز کر کے تمہیں اپنایا تھا غزل، کیونکہ مجھے یقین تھا تم پر۔'' دونوں کے چہرے بھیگنے لگے تھے۔ بارش تیز ہو رہی تھی۔

''تو میرا کیا ہاں؟ میرا کیا جو پہاڑوں میں رہتی ہے۔ جسے دنیا کا کچھ نہیں پتا؟ جو ایک اجنبی کی باتوں پر یقین کر لیتی ہے اس سے شادی کر لیتی ہے؟ آپ نے کہا چھوڑ دیا سب کو میں نے یقین کر لیا۔ میں نے بھی تو یقین کیا ناں۔ میں نے بھی یقین کیا ناں لیکن ہوا کیا؟ میرا یقین خود بخود ٹوٹ گیا جیسے میرا وجود جیسے میری روح ......'' غزل میر کے چہرے پر پانی تھا۔ لیکن صرف غزل میری جانتی تھی بارش کی اس آڑ میں اس نے بہت سے آنسوؤں بھی بہائے تھے۔

''دوسری شادی ضروری نہیں بیوفائی کی علامت ہو؟'' گل شاد حسین نے کہا تھا۔

''پھر کس کی علامت ہے؟ دھوکے کی؟ جھوٹ کی؟ یا بزدلی کی؟'' غزل میر نے اپنا بازو چھڑوا دیا۔

''تم مجھے بار بار بزدل مت کہو۔ بزدل ہوتا تو تم سے شادی نہ کرتا۔ بزدل ہوتا تو تمہارے ماں باپ سے تمہیں نہیں مانگتا۔ بزدل ہوتا تو محبت نہیں کرتا۔''

''محبت؟ کون سی محبت؟ آپ محبت کا نام مت لیں۔ محبت کا نام ایسے لوگوں کے منہ سے اچھا نہیں لگتا جو محبت نہیں محبتیں کرتے ہوں۔''

اس نے دل کی بھڑاس نکالی۔ وہ عورت تھی نہ شراکت برداشت کر سکتی تھی نہ بیوفائی۔ لیکن جس عورت کی قسمت میں ان میں سے کوئی ایک چیز بھی لکھ دی جائے تو وہ آخر کر بھی کیا سکتی ہے؟ مرد کے پاس اختیار ہے عورت کے پاس ایسا کوئی اختیار نہیں۔

''تم میرے کردار کے بارے میں بات کر رہی ہو غزل۔ میں مانتا ہوں تمہارے ساتھ غلط ہوا ہے لیکن تم مجھے بدکردار نہیں ٹھہرا سکتی۔ تم نے میرے بارے میں کچھ نہیں سنا جب کہ میں پورے کشمیر میں تمہارے بارے میں ہزار باتیں سن چکا ہوں۔ تمہارا پہلا رشتہ کس وجہ سے ٹوٹا تھا کیا تم بھول گئی ہو؟'' اس بار گل شاد حسین نے سخت لہجے میں کہا تھا۔ سب چیزیں اب اس کے بس سے باہر جا رہی تھیں۔

''اور دنیا میں ہزاروں مرد کرتے ہیں دوسری شادی۔ اسلام نے اجازت دی ہے۔ میں تمہیں چھوڑ تو نہیں رہا نہ چھوڑوں گا۔ تم میری محبت تھی جب کہ وہ رشتہ مجبوری کے تحت بنا ہے۔''

''کیونکہ میں شہر میں آپ کے ساتھ نہیں رہتی جو آپ کے بارے میں کچھ سنوں۔'' غزل میر نے اپنا لہجہ نہیں بدلا۔

"تمہیں مجھ پر شک ہے؟" وہ بے یقینی سے بولا تھا۔ بارش تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن بارش نے جیسے ان دونوں پر کسی قسم کے کوئی اثرات نہیں چھوڑے تھے۔ وہ ہنوز ایک دوسرے میں گم تھے۔

"شک تو آپ کو تھا مجھ پر۔ آپ نے تو میرے شک کو یقین میں بدل دیا۔ چلے جائیں یہاں سے۔ مجھے آپ کی شکل نہیں دیکھنی۔ مجھے نفرت ہے آپ سے۔ آپ کے وجود سے آپ کی باتوں سے۔" پھر اسی انداز میں کہا۔

"تم عورتیں کبھی مردوں کو مت سمجھنا۔ مردوں کو کاملیت کے درجے پر بٹھانا تم عورتوں کا سب سے پسندیدہ شوق ہے۔ پھر جو کاملیت ذرا سی کم پڑے تم لوگ اسے اپنی زندگی سے ہی نکال دیتی ہو۔" گل شاد حسین بھی چیخا تھا۔ رات ہونے میں کچھ وقت تھا۔ پر بارش کی وجہ سے اندھیرا بڑھ رہا تھا۔

"مرد کو مرد رہنا چاہیے۔ مرد بہادر، نڈر اور نرم مزاج ہوتا ہے۔ جو مرد بزدل ہو وہ پھر مرد نہیں نامرد بن جاتا ہے۔ غزل کے معاملے میں جو گل شاد حسین نے کیا ہے ناں وہ نامردی کی ہی علامت ہے۔" وہ طنزیہ ہنسی تھی پر اگلے ہی لمحے گال پر پڑنے والے تھپڑ نے چند پلوں کے لیے ہر شے کو ساکت کر دیا تھا جن میں نمایاں غزل میر کا دل تھا۔ اس کی دھڑکن تھی۔ وہ غصے میں تھی اور غصہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ وہ کیا کہہ رہی ہے، کیوں کہہ رہی ہے، اسے کچھ سمجھ نہ آیا۔ وہ تو بھڑاس نکال رہی تھی دل میں بسی ہر بھڑاس۔

"تم ایک انتہائی بیوقوف عورت ہو۔ تم سے محبت میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے۔" گل شاد حسین سرخ چہرے کے ساتھ دھاڑا تھا۔ پھر وہاں رکا نہیں تھا تیز تیز قدم اٹھاتا گھر کی جانب چلا گیا تھا۔ جب کہ غزل وہیں زمین پر گر گئی تھی۔ پھر سارے جنگل نے غزل

میر کو دھاڑیں مار کے روتا سنا تھا۔ وہ تب بھی نہیں روئی تھی جب گل شاد حسین کی دوسری شادی کی خبر سنی تھی۔ گل شاد حسین برستی بارش میں تیز تیز قدم اٹھاتا گھر کی جانب گامزن تھا۔ وہ اس قدر غصے میں تھا کہ اس کا دل کر رہا تھا کسی پہاڑ پر سے خودکشی کر لے۔ نہ وہ رہے نہ اس کی زندگی کی جھنجھٹ۔ محبت دور کھڑی دونوں کو ترحم سے دیکھ رہی تھی۔

وہ گھر کی طرف جانے کے بجائے شہر جانے کے لیے بس پر آ بیٹھا تھا۔ فون کر کے ماں باپ سے اس نے کہہ دیا تھا اپنی بہو کو لے آنا خود گھر۔ اور پھر بنا کچھ سنے کال بند کر دی تھی۔ وہ دن عجیب گھٹن زدہ تھے۔ اسے ہر بار غزل پر غصہ آتا تھا۔ وہ کیسے اسے نامرد کہہ سکتی تھی؟ وہ گل شاد حسین کو سمجھتی کیوں نہیں تھی؟ ہر شے میں غزل کا قصور نظر آتا تھا۔ دن یونہی گزرتے رہے۔ دن ہفتوں میں ڈھلے ہفتے مہینوں میں۔ آہستہ آہستہ اسے غزل سے کیا گیا اپنا رویہ یاد آیا تھا۔ اپنا مارے جانے والا تھپڑ بھی یاد آیا تھا۔ اور غزل کی کسی زمانے میں کہی بات بھی۔ ''مجھے ایسے مردوں سے نفرت ہے جو اپنی عورتوں پر ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ مرد کی مردانگی عورتوں پر ہاتھ اٹھانے سے ثابت نہیں ہو جاتی۔'' اور پھر ہر جذبہ گلٹ میں بدلنے لگا تھا، اور گلٹ غم میں۔ شہریار اس سے ملنے شہر آیا تھا جب گل شاد حسین نے اسے غزل سے اپنی آخری ملاقات کے بارے میں بتایا۔ تب شہریار نے گہری سانس لی تھی، اسے پتا تھا غلطی دونوں کی ہے۔ اس سے زیادہ حالات نے دونوں کو کسی قابل نہیں چھوڑا تھا۔

''عورت ناقص العقل ہوتی ہے پر گل شاد حسین۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس میں عقل نہیں ہے بلکہ اس کا یہ مطلب ہوتا ہے وہ عقل سے زیادہ جذبات سے کام لیتی ہے۔ وہ دماغ کو آڑے نہیں آنے دیتی، وہ دل کو ڈھارس بنا دیتی ہے۔ وہ جس سے محبت کرتی ہے اسے ہر بار معاف کر دیتی ہے۔ اور کرتی جاتی ہے۔ بیوفائی بھی برداشت کر لیتی ہے، شراکت

بھی۔ یہ سب کچھ مکمل عقل رکھنے والا مرد نہیں کرسکتا۔ کیونکہ مرد دماغ سے جب کہ عورت دل سے سوچتی ہے۔" شہریار نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ اس وقت غصے میں تھی۔ دل کی بھڑاس تمہارے سامنے نہ نکالتی تو کس سے کہتی؟ دل جس نے دکھایا ہو اس کی شکایت بھی اسی سے کرتے ہیں دوسروں سے نہیں۔ دوسرے بھلا کیا کرسکتے ہیں؟ تم برداشت کر لیتے، خاموشی سے سن لیتے، یا پھر وہاں سے آتے نہیں۔" اس نے کہا تھا۔

"تم بتادو سب کو کہ غزل تمہاری بیوی ہے اور اسے عزت سے لے آؤ یہاں۔ یہ واحد حل ہے اس سب مشکلوں کا۔ تمہیں یہ بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔" اس نے کہا تھا اور گل شاد حسین نے واقعی دیر نہیں کی تھی۔ اس نے اپنے ماں باپ کو غزل کے بارے میں بتادیا تھا۔ وہ اس بات پر بے حد صدمے میں تھے۔

"تم نے شادی کی ہے وہ بھی کئی سال پہلے؟" محمد حسین نے بے حد ششدر لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔

"ہاں اور میں اس بار کشمیر جاؤں گا تو اسے ساتھ لے آؤں گا۔ اور سارے کشمیر کے سامنے لاؤں گا۔ میں نے شادی کی ہے کوئی گناہ نہیں۔ آپ لوگ سن لیں اگر آپ لوگوں میں سے کسی نے مجھے روکنے کی کوشش کی یا غزل کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" وہ بے تاثر لہجے میں کہہ کر وہاں رکا نہیں تھا، سیدھا سامان باندھ کر کشمیر کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔ کبھی کبھی انسان کی زندگی میں ایسا وقت آتا ہے جب وہ بے حد نڈر ہو جاتا ہے۔ اسے کسی شے سے فرق نہیں پڑتا، اسے کسی عمل کے نتائج سے خوف نہیں آتا۔ وہ جیسے ہر معاملات کے لیے تیار ہوتا ہے یا پھر بے پروا ہو جاتا ہے۔ شہریار نے ایک مرتبہ پھر دوستی

نبھائی تھی۔ ایک ایسا دوست جو آپ کو مشکلوں سے نکال کر راحتوں کے دور میں لے آئے کیا اس سے بڑی نعمت کوئی ہو سکتی ہے؟...... یہ کیسا دوست تھا جو ہر دفعہ دل نئے سرے سے جوڑ دیتا تھا۔ وہ دل بھی جوڑ دیتا تھا جو اس نے نہیں توڑا ہوتا تھا۔ وہ آفتوں کے دور میں امن بن کر آتا تھا ہمیشہ۔ جوانا آڑے آ بھی رہی تھی اتنے عرصے سے وہ شہریار کی باتوں سے کہیں جا سوئی تھی۔ جن دنوں وہ کشمیر گیا تھا وہ وہی موسم تھا جس موسم میں اس نے غزل کو پہلی بار دیکھا تھا۔ بہار کا اختتام ہو چکا تھا۔

اس بار کشمیر میں آنے کی خوشی ہر دفعہ آنے سے زیادہ تھی۔ شہریار نے فون کر کے شاہ میر کو بتا دیا تھا کہ گل شاد حسین کل کشمیر آ رہا ہے۔ وہ ان کے گھر ہی آئے گا۔ اور بیٹی اور داماد کی صلح ہوتے دیکھ کر شاہ میر بھی خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا، یہ چیز اس کے لہجے سے پتا لگ رہی تھی۔ گل شاد حسین نے سوچا کیا غزل بھی اس کا انتظار کر رہی ہوگی؟ یا پھر وہ ہنوز ناراض ہوگی؟ پر اب کی بار غزل کا جو بھی رویہ ہوا وہ اسے اپنے ساتھ شہر لے آئے گا۔ وہ بھی دھوم دھام سے۔

گاڑی سے اترنے کے بعد وہ اپنے گھر کے بجائے سیدھا پہاڑوں پر بنے غزل کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہاڑوں پر بنے گھر کی یاد اسے زیادہ آتی تھی یا اس میں بسنے والی مکیں کی، اس بات کا اسے کبھی اندازہ نہیں ہوا مگر ہاں دل ہمیشہ کہتا تھا یہ جو یاد ہے وہ مکیں کی ہی ہے۔ اس کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ بات بے بات مسکرا رہا تھا۔ ایک بار پھر وہ گل شاد حسین بن گیا تھا جو غزل سے ناراضگی سے پہلے ہوا کرتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اب یہیں سے گھر جا کر ماں باپ کو فون کرے گا کہ اپنی بہو کو لے جانے پہنچ جائیں۔ اس نے نگہت کو بھی فون کیا تھا اور وہ اس کے توقع کے مطابق خوش تھی۔ پچھلی بار کی نسبت اس بار بارش نہیں ہوئی تھی۔ گرمی تیز تھی لیکن شہر

سے آنے والے گل شاد حسین کو تو موسم خوشگوار ہی لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ الجھن میں تب تبدیل ہوئی جب شاہ میر کے گھر کے کچھ فاصلے پر اسے چند لوگ دائرے کی صورت نظر آئے۔ یہ وہ راستہ تھا جو سیدھا شاہ میر کے گھر جاتا تھا یہاں اونچا اور نیچا جیسا کچھ نہ تھا۔ وہ تھوڑا اور قریب آیا۔ رونے کی آوازیں، ماتم کرتے لہجے۔

''غزل میری بچی غزل۔'' پہلی آواز اسے امی (حُسنِ جان) کی سنائی دی۔ چند پلوں کو اس کی دل کی دھڑکن تھمی۔ لوگوں نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ ہاتھ میں سیاہ بیگ تھامے ہوئے وہ سیاہ جینز کے ساتھ سفید شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ لوگوں نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔

''ددو، ددو۔ میں بتا رہا ہوں بات نہیں کروں گا آپ سے۔'' گل شاد حسین نے دوسری آواز غازان کی سنی تھی۔

''فوجی بابو! آپ کہاں؟ ان کی بیٹی غزل کو سانپ نے کاٹا ہے کچھ وقت پہلے۔ ابھی چند منٹ ہوئے اسے فوت ہوئے۔'' بہت سے لوگ اس کی طرف بڑھے۔ اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ نہ شاہ میر نہ حُسنِ جان اور نہ ہی غزل، لوگ اردگرد جمع تھے اور پھر لوگوں کے درمیان سے بھاگتا ہوا فوجی کٹنگ اور کسرتی بازو لیے غازان آیا اور اس کا ہاتھ تھاما۔ گل شاد حسین نے ساکت نظریں اس کی طرف گھمائیں اور پھر اسے یاد آیا وہ سانس روکے کھڑا ہے۔

''گل شاد بھائی! آپ کہیں ددو کو وہ مجھ سے بات کریں، اپنے غازی سے بات کریں۔'' وہ اسے گھسیٹتا ہوا لوگوں کے بیچ سے لے جانے لگا۔ اور گل شاد حسین بنا کچھ بولے کٹی پتنگ کی طرح اس کے ساتھ جانے لگا۔ لوگ پہلے کی نسبت مزید زیادہ ہو گئے تھے۔ فوتگی ہو گئی تھی لوگ اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ آگے بڑھا اور پھر اس نے شاہ میر کی گود میں ساکت پڑی سفید دودھ سا چہرہ لیے اسے دیکھا۔ وہ آج بھی سرخ میں ملبوس تھی۔ ایسا سرخ جو پہلی بار اس

نے اسے پہنا دیکھا تھا بس فرق یہ تھا کہ وہ کپڑے اس کے باپ نے دلائے تھے غزل کو اور یہ کپڑے اس کے شوہر نے۔ منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی اور چہرہ بے حد سفید مگر پُرسکون تھا۔ گل شاد حسین رک گیا۔

''دیکھیں نا ددو، کون آیا ہے؟ اب بھی آپ نہیں اٹھیں گی؟ آپ تو گل شاد بھائی کی ایک پکار پر اٹھ جانے والی تھیں۔ آپ انتظار کر رہی تھیں ناں اپنے شوہر کا، دیکھیں وہ آ گیا ہے۔'' غازان مسلسل بول رہا تھا۔ آنسو بھی بہہ رہے تھے۔ اس نے پھر اسے کھینچا پر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ غازان اس کا ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھا، وہ ماں کو گلے لگائے بہن کا چہرہ تھپتھپا رہا تھا۔ ماں جو اونچی آواز میں بین کر رہی تھی۔ شاہ میر خاموشی سے آنسو بہا رہا تھا۔ غزل میر نہیں تھی تو سب اندھیر تھا۔ اس کے پاؤں کے پاس کچھ وقفے پر گل شاد حسین ڈھے گیا۔ سب اس کی طرف بھاگے۔ پر اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ پورا اندھیرے میں ڈوب گیا۔

☆......☆......☆

''گل شاد پتر اٹھ جا۔'' اسے جب ہوش آیا تو ایک شناسا آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ ذہن بالکل خالی تھا۔ بہت سوچنے کے باوجود کوئی سوچ ذہن میں نہ آتی تھی۔

''گل شاد؟'' اس نے آنکھیں پھر بند کر دی تھیں پر اپنے نام کی پکار سن کر پھر سے کھول دیں، اس بار چہرہ دائیں جانب گھمایا۔ دائیں جانب کھڑا ہونے والا چہرہ شناسا تھا۔

''کچھ دیر میں تدفین ہے۔ اگر ایک بار غزل کو دیکھنا چاہتے ہو تو اٹھ جاؤ۔'' ان کے لہجے میں بے حد نرمی تھی اور کیا تھا ندامت۔ شرمندگی، پچھتاوا گل شاد حسین سمجھ نہیں پایا۔ باپ کی

بات سے اسے یاد آیا کہ اس کے حواس کس خبر سے ساتھ چھوڑ گئے تھے۔اور پھر ہر شے یاد آتی گئی۔دماغ پھٹنے لگا وہ اٹھ بیٹھا۔

''گل شاد، اٹھ جاؤ آخری بار اسے دیکھ لو۔'' وہ پھر سے بولے۔گل شاد حسین نے خاموش نظروں سے انہیں دیکھا۔

''کس حق سے؟ اب کس حق سے؟'' پھر بے حد دھیمی آواز میں کہا۔لہجہ بے تاثر، چہرہ بے تاثر آنکھیں محمد حسین نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔وہ خالی تھیں۔ان میں کچھ بھی نہ تھا کچھ بھی۔انہیں اذیت ہوئی پر گل شاد حسین ان کی طرف متوجہ ہوئے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔سب لوگوں کو نظر انداز کرتا وہ پہاڑوں پر بنے غزل میر کے گھر سے دور ہوتا گیا۔

غزل کو دنیا سے گئے دوسرا دن تھا اور گل شاد حسین کے روح دار جسم کو خالی پتلا بنے ہوئے بھی یہ دوسرا دن تھا۔وہ جس راستے سے آیا تھا اسی راستے سے واپس ہو گیا۔خالی دماغ، خالی آنکھوں اور خالی جسم کے ساتھ۔اس نے ایک آنسو نہ بہایا وہ واپس آ کر اپنی جاب پر جانے لگا۔پچھلے سال اس کی پروموشن ہوئی تھی۔وہ مصروف ہو گیا۔اس کے روزمرہ میں کوئی فرق نہ آیا۔بس بہت بولنے والا خوش مزاج سا گل شاد حسین کہیں گم ہو گیا تھا۔وہ اب بولتا نہیں تھا۔خود سے کبھی کسی سے مخاطب نہیں ہوتا تھا۔وہ بیٹھے بیٹھے جانے کہاں کھو جاتا تھا۔اس کا کھانا آدھا ہو گیا تھا۔اس کا گھومنے کا شوق ختم ہو چکا تھا۔اس کی آنکھوں کے گرد گہرے حلقے ہوتے تھے۔اور آنکھیں ان میں کوئی جذبہ نہ تھا۔وہ خشک تھیں ان میں نمی بھی نہ تھی۔عرصہ ہوا گل شاد حسین کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔

محبت کے تیسرے مرحلے نے انہیں بہت بری طرح ہرایا تھا۔محبت کا تیسرا مرحلہ قدر کا ہوتا ہے اور گل شاد حسین اور غزل میر نے محبت کی قدر نہ کی تھی اور قسمت کی دی جانے والی

محبت کی قدر نہ کرنے پر قسمت نے انہیں بری طرح تڑپایا تھا اور مار دیا تھا۔
یہ غزل کو دنیا سے گئے تیسرا سال تھا۔ تیسرا سال؟ گل شاد حسین کو لگتا تھا تین سو سال ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے گھر آیا تھا، اس بار چھ مہینوں بعد وہ بہت کم گھر آتا تھا بلکہ تین سے چار مرتبہ آیا تھا ان سالوں میں۔ تب اس نے لاؤنج میں بیٹھے فرد کو دیکھا۔ اسے پہچاننے میں گل شاد حسین کو لمحہ بھی نہ لگا۔ وہ غازان تھا۔ غزل کا بھائی۔ گل شاد حسین بے حد خاموشی سے آگے بڑھا جب کہ غازان لپک کر اس کی طرف بڑھا تھا۔
''گل شاد بھائی۔'' وہ بے اختیار اس کے گلے لگا تھا۔ لاؤنج میں اور کوئی نہیں تھا نہ اس کے دو بیٹے، نہ دوسری بیوی اور نہ ہی ماں باپ۔ جیسے وہ جان بوجھ کر غزل کے دو رشتے داروں کو ایک دوسرے سے ملنے کا موقع دے رہے تھے۔
''جس کے رشتے کے ذریعے تم مجھے فوجی بھائی سے گل شاد بھائی پکارنے لگے تھے وہ تو اب ہے نہیں تو پھر یہ نام کیوں؟'' گل شاد بے حد آہستہ سے بڑبڑایا۔
''آپ نے تو ہمیں بھلا دیا۔ ہمیں لگا ددو کے ساتھ ہم نے آپ کو بھی کھو دیا ہے۔'' غازان کی آواز میں نمی گھل گئی اور پھر وہ آہستہ آہستہ سسکیاں لینے لگا۔ وہ مرد تھا لیکن وہ اپنی اکلوتی بہن کے لیے آج بھی تڑپتا تھا۔ وہ اس کی بڑی بہن نہیں تھی اس کی کل کائنات تھی۔ گل شاد حسین نے خاموشی سے اسے تھپکی دی۔ وہ اور رونے لگا۔
''آپ کیوں ہم سے ملنے نہیں آئے؟ ددو کو بھی نہیں دیکھا اور نہ ہماری کوئی خبر لی؟ آپ کو پتا ہے ناں ددو کے ناطے آپ ہمیں کتنے عزیز ہیں۔'' غزل کا بھائی غزل کے شوہر سے شکوے کر رہا تھا۔ وہ سارے غزل سے جڑے تھے۔ ان کی زندگی کی داستان میں غزل ہی غزل تھی۔ وہ جو بے حد عام تھی پر سب سے خاص لگتی تھی۔ چند منٹوں بعد وہ دونوں صوفے پر بیٹھے تھے۔

"آپ کشمیر کیوں نہیں آتے اب؟ کیا آپ کو کشمیر کے پہاڑ یاد نہیں آتے؟" غازان اب خود کو سنبھال گیا تھا۔ چہرہ آنسوؤں سے اب خشک تھا پر آنکھوں میں نمی ہنوز موجود تھی چہرہ غم کا گہوارہ تھا۔

"پہاڑوں میں بسنے والی غزل میر اب وہاں نہیں ہے۔ نہ کشمیر میں نہ کشمیر کے کسی پہاڑ میں، نہ کشمیر کے کسی جنگل میں تو پھر گل شاد حسین کو وہاں سے کیا لینا دینا؟ کشمیر کے پہاڑوں کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے اگر غزل میر کی موجودگی وہاں نہیں ہے تو گل شاد حسین کی بھی نہیں ہو گی۔" وہ نیچے بچھی سیاہ قالین کو دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

"پر ان کی یادیں تو ہیں وہاں گل شاد بھائی......" غازان نے اذیت سے کہا تھا۔

"وہ تو یہاں ہیں۔ غزل میر کو یاد کرنے کے لیے گل شاد حسین کو پہاڑوں پر جانے کی کیا ضرورت جو وہ دل زار میں جھانکتا ہے اور وہاں دل کو صحت مند پاتا ہے وہاں ہر طرف غزل میر موجود ہے۔ سوائے آخری ملاقات کے جس کے بارے میں وہ نہیں سوچتا، سوچ آنے پر سوچ بدل دیتا ہے۔" وہ اسی انداز میں کہہ رہا تھا۔

غازان کافی دیر وہاں رکا تھا جتنی دیر وہاں رکا وہ غزل کی باتیں کرتا رہا۔ چند باتیں اپنی بیوی بچوں اور ماں باپ کے بارے میں تھیں۔ جیسے اسے عرصے بعد غزل میر کا عکس ملا تھا غزل میر سے باتیں کرنے کے لیے۔

"یہ آپ کی امانت ہے۔ یہ ددو کا تھا اب آپ کا ہے۔" جانے سے پہلے وہ وہی لوہے کا صندوقچہ گل شاد حسین کے حوالے کر گیا تھا جو غزل کا تھا۔ جو اس نے شادی کی پہلی رات گل شاد حسین کو دکھایا تھا۔

☆......☆......☆

وہ چھوٹا سا صندوقچہ اس کے پاس تھا۔ وہ اسے پہروں دیکھتا تھا، لیکن کھولے بغیر۔ اتنے عرصے بعد کسی نے غزل کے بارے میں اس سے اتنی لمبی باتیں کی تھیں۔ دل تھا جو پہلے ہی نہیں سنبھل رہا تھا مزید بے چین ہوا تھا۔ اس نے کسی کو بھی غزل کے ذکر کرنے سے منع کر دیا تھا۔ کوئی اس کے سامنے اس کی بیوی کا نام نہیں لیتا تھا، لیکن اتنے عرصے بعد دل تھا کہ پھٹ رہا تھا۔ پر جانے آنسو کہاں تھے جو بہہ ہی نہیں رہے تھے۔ آنسوؤں کو کیا ہو گیا تھا؟ یہ آنسو کیوں نہیں آتے تھے، کیوں نہیں بہتے تھے۔

کچھ عرصہ وہ بند صندوقچے کو دیکھتا گیا اور پھر ایک دن اس نے ہمت کر کے اسے کھول دیا۔ وہ اس شام مارگلہ کی پہاڑی پر بیٹھا تھا۔ وہ کشمیر نہیں تھا پر وہاں سبزہ موجود تھا جو اس کے دل کو یاد دلاتا تھا۔ ہاں ایک کشمیر ہے جو حسین ہوا کرتا تھا؟ تھا؟ ہاں تھا کشمیر، کشمیر کے باسیوں سے حسین ہوتا تھا۔ جب باسی نہ رہے تو حُسن بھی ختم ہو گیا۔

چند پل وہ دور دیکھتا رہا، دور کہیں کسی خلا میں۔ پھر اس نے لوہے کا وہ چھوٹا سا صندوقچہ کھولا۔ ایک دم جیسے غزل اس کی یادوں سے نکل کر اس میں بکھرے کاغذوں میں شامل ہو گئی تھی۔ سب سے اوپر سرخ ڈائری تھی۔ وہ آج بھی ویسی ہی تھی۔ گل شاد حسین کی خالی آنکھوں میں عرصے بعد کوئی تاثر ابھرا تھا۔ وہ اذیت کا تاثر تھا۔ اس نے اس ڈائری کو نکالا اور پھر چند لمحے دیکھنے کے بعد اسے ہونٹوں سے چھوا، پھر اس نے ایک جانب پتھر پر رکھ دی۔ ڈائری کے بعد بہت سارے ورق تھے۔ مڑے ہوئے، بے ترتیب، چھوٹے، بڑے۔ اس نے وہ بھی نکالے۔

ان بے شمار صفحوں پر ایک ہی شے تھی۔ ایک ہی درد تھا۔ ایک ہی غزل تھی۔ گل شاد حسین نے زیرِ لب اس نظم کو پڑھا۔

''پھر کوئی آیا دل زار، نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزر
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھاؤ مئے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔''

مارگلہ پہاڑی نے، وہاں بکھرے سبزے نے، اور گل شاد حسین نے اپنے چہرے کو بھیگتے پایا۔ گالوں پر لڑیوں کی صورت بے رنگ مائع بہنے لگا۔ اور پھر وقت نے گل شاد حسین کو سسکتے دیکھا۔ ہواؤں میں اڑان بھرے پرندوں نے گل شاد حسین کو آنسو بہاتے دیکھا۔ گل شاد حسین صدیوں بعد اپنی محبوب بیوی کے لیے آنسو بہا رہا تھا۔ عرصے بعد کوئی جذبہ تھا جو دل میں جاگا تھا۔ کچھ تھا جو اسے محسوس ہوا تھا۔ عرصے بعد وہ سکتے کے عالم سے نکلا تھا۔ جیسے صدیوں بعد وہ صدمے سے باہر آیا تھا۔

''پھر کوئی آیا دلِ زار؟'' ہر طرف اس نظم کے لفظ بکھرنے لگے۔ ہر طرف ہجر کا سناٹا چھاتا گیا۔

اس نے پہلے وہ ڈائری نکالی جس میں غزل میر کا بچپن تھا۔ لمحے سرکتے گئے وہ آنسو صاف کیے پڑھتا گیا۔ بعض جگہ ہنس دیتا بعض جگہ حیرت سے لفظوں کو دیکھنے لگتا۔ وہ پہاڑوں

میں رہنے والی غزل میر کو جان رہا تھا۔ پھر یکے بعد دیگرے اس نے سرخ ڈائری ہاتھوں میں تھامی۔ ہاتھ کپکپائے۔ آنکھیں پھر سے بھیگنے لگیں۔ گل شاد حسین کو پتا تھا اس ڈائری میں موجود ایک ایک لفظ پڑھتے ہوئے اس نے کس اذیت سے گزرنا ہے۔ اس نے پہلا ورق کھولا۔ وہ اب مارگلہ پہاڑی پر نہیں تھا وہ کہیں دور تھا کسی اور کے سنگ؟ غزل میر کے سنگ غزل میر کے پہاڑوں میں۔

☆......☆......☆

یہ وہ دن تھا جس دن گل شاد حسین نے غزل میر کے باپ سے غزل میر کو مانگا تھا۔ وہ حیرت کو جھٹکتی چڑھتی ہوئی اپنے گھر کی طرف آگئی۔

ٹکر ٹکر اس نے اماں ابا کا چہرہ دیکھا۔ وہ اپنے کاموں میں مگن تھے۔ پر چہرے پر الجھن رقم تھی جو صاف دکھائی دیتی تھی۔ اور اس الجھن کو رات کے کھانے کے بعد چولہے کے پاس بیٹھتے اماں نے ختم کیا تھا۔

''آج مہمان آئے تھے۔'' اماں نے تمہید باندھی۔ ابا غالباً کمرے میں تھے۔ غزل میر کا دل لمحے بھر کو ساکت ہوا۔ دل کی دھڑکن سست روی سے چلنے لگی۔ چہرہ ششدر تھا۔

''حسین بھائی کو تو تم جانتی ہوگی، ان کا بیٹا آیا تھا۔ تیرے ابا سے تیرا رشتہ مانگنے۔'' اماں نے چولہے پر چائے کی کیتلی رکھتے ہوئے کہا۔ غزل میر کے دل نے رفتار پکڑی تھی۔ اس نے چہرہ آگ کی طرف موڑا اب وہ شعلوں کو دیکھ رہی تھی۔ اماں اسے ساری شام کی روداد سناتی گئیں۔ وہ چہرہ جھکائے سنتی گئی۔

''تمہارا کیا فیصلہ ہے غزل؟'' اماں کی اسے آواز آئی تو وہ چونکی۔ اس نے شام کی روداد کے بعد اماں جو اپنی نصیحتیں کر رہی تھیں وہ نہیں سنی تھیں۔ اسے اس وقت صرف اوپر سے نیچے

اترتا ہوا، بلندی سے پستی کی طرف آتا ہوا، خود کے برابر کھڑا ہوتا ہوا گل شاد حسین نظر آ رہا تھا۔ اور اب یہ سوال۔ اس نے چند لمحے آنکھیں بند کیں۔ دل اور دماغ دونوں میں وہ تھا۔ کیا جب پہلے اس کا رشتہ جس سے طے ہوا تھا یہ احساس اسے محسوس ہوا تھا؟ دل کا جواب نہیں کی صورت میں تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں آگ کے شعلے میں اب وہ تھا۔ غزل نے دور اندھیرے میں دیکھا وہاں بھی وہ تھا۔ وہ ہر جگہ جیسے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جیسے اس کے حواسوں پر چھا رہا تھا۔ کیا اس نے اس پر کوئی سحر کر دیا تھا جو وہ اس کی طرف یوں مائل ہو رہی تھی؟

''میرا فیصلہ وہی ہے جو میرے والدین کا فیصلہ ہے۔'' اس نے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس رات غزل میر سحر ہونے تک سوئی نہ تھی۔ اس رات غزل میر حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ وہ مغلوں کا پہلا ایسا مرد تھا جو غزل میر کو غزل میر سے نہیں مانگ رہا تھا۔ وہ مغلوں کا پہلا ایسا مرد تھا جس نے غزل میر سے محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اور وہ واحد مغل مرد تھا جو مرد تھا۔ جو تنہائی میں نہیں محفل میں اسے قبول کرنے کے لیے تیار تھا۔ یہ کیسی محبت تھی گل شاد حسین کی جو اسے اس قدر نڈر بنا رہی تھی۔ وہ بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دیوار پر لگا چھوٹا سا آئینہ سامنے تھا۔ لال ٹین کی زرد روشنی میں اس نے اپنے چہرے کو دیکھا۔ ایسا کیا تھا اس کے چہرے میں کہ گل شاد حسین یوں اس پر مر مٹا تھا۔ اسے مہندی کی رات گل شاد حسین کا بولنے والا جملہ یاد آیا۔

''تم تو واقعی غزل ہو۔'' لال ٹین کی زرد روشنی نے پہاڑوں کی غزل کے گال سرخ ہوتے دیکھے۔ اس نے پھر اپنے چہرے کو نہ دیکھا، دیکھ ہی نہیں سکی وہ پھر سے اپنے بستر پر آ لیٹی۔ اگلے دن صبح صبح شاہ میر اس کے پاس آیا تھا۔ وہ سارا کام ختم کر کے اب لکڑیاں تلاشنے پاس

کے جنگل میں جارہی تھی۔

''میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ غزل۔'' اسے ابو کی آواز آئی۔ وہ حیران ہوئی پھر جیسے سمجھ گئی۔

''آجائیں ابو۔'' وہ کہہ کر چل پڑی۔ سبز رنگ کے کپڑوں میں ملبوس دوپٹہ سر پر اوڑھے وہ اب آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگی تھی۔

''تمہاری اماں نے تم سے کوئی بات کی تھی؟'' ساتھ ساتھ چلتے شاہ میر نے اس سے پوچھا۔ غزل کے گال سرخ ہوئے۔ کشمیر میں شادیوں کی بات یوں باپ نہیں پوچھا کرتے تھے۔ یہ رواج عام نہیں تھا۔

''جی۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

''تو کیا فیصلہ ہے تمہارا؟'' وہ اب اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ غزل نے رک کر انہیں دیکھا۔

''جیسا آپ چاہیں ابو۔ غزل میر کو آپ پر یقین ہے۔'' وہ دھیمے سے بولتی آگے بڑھ گئی۔

''تو خوش رہے گی غزل۔ تو بڑی ہو کر سمجھدار ہو گئی ہے لیکن تمہارے بچپن کے خواب تمہاری باتیں میرے لیے بڑے نہیں ہوئے۔ میں چاہتا ہوں تو ویسے ہی خوش رہے جیسے یہاں اپنے باپ کے گھر رہتی ہے۔ میرے شناسا میں وہ تمہارے لیے سب سے بہترین ہے۔'' وہ اب ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ راستہ اب تنگ تھا۔ وہ آگے تھے غزل پیچھے۔

''وہ تجھے خوش رکھے گا، تو اس کی فرمانبردار بن کے رہنا۔ وہ مخلص رہے گا تو خدمت کرنا اس کی۔ گل شاد تجھے چاہتا ہے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں تیرے لیے اس کے

جذبات، جن میں چاہت کے ساتھ ساتھ احترام بھی تھا۔ تو ہمیشہ عزت کرنا اس کی۔'' وہ اب لکڑیاں تلاش کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ سمجھا رہے تھے، بتا رہے تھے۔ غزل میر جھجک سے انہیں سنتی گئی۔ وہ واحد باپ تھا جو دیہاتی ہو کر بیٹی سے شادی کے لیے اس کی مرضی پوچھ رہا تھا۔ اور وہ واحد باپ تھا جو بیٹی کو گھرداری سکھا رہا تھا۔ غزل میر کی آنکھیں بے ساختہ نم ہوئیں۔ پھر وقت سرکنے لگا۔ اس کے دل و دماغ میں پہلے کوئی نہیں تھا۔ لیکن اب بس ایک چہرہ تھا۔ اب بس ایک شخص تھا جس کا وہ انتظار کرتی تھی۔ اسے پتا تھا وہ تین ماہ بعد آئے گا پر ہر سویرے وہ راہ تکتی تھی، ہر شام منڈیر پر دور تک اس کی آمد کا انتظار کرتی تھی۔ پسند محبت میں کب بدلی اسے پتا نہیں تھا لیکن محبت کب اس کے پورے جسم میں سرائیت کر گئی۔ اس کا بھی اسے اندازہ نہ ہوا۔ تین ماہ کا انتظار چھے ماہ کے لیے مقیم ہو گیا۔ پہاڑوں پر بنے اس گھر میں جو مٹی کا تھا، جو پتھروں کا تھا، جس کے آس پاس گھنا جنگل تھا وہاں کی مقیم غزل میر اونچی لمبی مصنوعی عمارتوں میں رہنے والے گل شاد حسین کا انتظار کرنے لگی تھی، پہلے سے زیادہ پہلے سے شدید۔ محبت عجیب شے تھی۔ بس محبوب کا دیدار مانگتی تھی۔ محبت بس محبوب کے دید سے ہی اپنی پیاس بجھا سکتی تھی۔

اور پھر چھ ماہ بعد اسے اس کی خبر ملی۔ وہ جو دوسرے دن آ رہا تھا۔ غازان نے آ کر اسے بتایا تھا۔

''فوجی بھائی آ رہے ہیں کل۔ میں بہت خوش ہوں ددو۔'' وہ لکڑی چولہے میں ڈالے آگ جلا رہی تھی جب اس نے آ کر اطلاع دی۔ غزل کے ہاتھ کپکپائے۔ دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔

''میں بھی۔'' آہستہ سے زیرلب کہا۔ غازان نے نہیں سنا۔ تو پھر انتظار ختم ہوا؟ وہ وہیں

بیٹھی چولہے میں جلتی آگ کو دیکھ کر کہہ رہی تھی۔

دوسرے دن نکاح نامے پر دستخط کرتے ہوئے اور گل شاد حسین کے ساتھ اپنا نام جوڑتے ہوئے اس نے کچھ کہا تھا۔ کسی نے نہیں سنا تھا پر وقت نے اس کے الفاظوں کو سنہرے لفظوں میں تاریخ کے پنوں پر تحریر کیا تھا۔

''قبول ہے۔'' اس نے دھیمے سے کہا پھر زیر لب بولی۔

(''غزل میر نے خود کو گل شاد حسین کے سپرد کیا۔ اس کے دل میں پہلے کوئی نہ تھا اس کے دل میں بعد میں بھی کوئی نہیں ہوگا۔ وہ واحد مرد جو اس کی زندگی میں ہے یعنی گل شاد حسین وہی اس کے دل میں بھی مقیم ہے۔'')

''قبول ہے۔ (غزل میر نے گل شاد حسین کو قبول کیا اپنے تمام تر وجود کے ساتھ جس میں سرِ فہرست قلب ہے۔'')

''قبول ہے۔'' (''غزل میر کو گل شاد حسین کا ساتھ قبول ہے اس دنیا میں بھی اور صدیوں بعد جنت میں بھی۔'')

غزل میر نے گل شاد حسین کے ساتھ خود کو جیسے کسی طلسم میں پایا تھا۔ جہاں صرف وہ دونوں تھے، جو ساتھ تھے، ایک تھے۔ ایک دوسرے کے لیے تھے۔ حقیقت تھی سحر انگیز کر رہی تھی۔ کشمیر کے پہاڑوں نے وقت سے پوچھا آخر محبوب کون ہے اور عاشق کون؟ پر چنار کے اونچے اور وسیع درختوں سے لے کر، گھنے جنگلوں تک، ٹھنڈے میٹھے چشموں سے لے کر یخ ہوا تک کسی کے پاس اس بات کا جواب نہیں تھا۔ وہ دونوں ہی عاشق تھے اور وہ دونوں ہی محبوب تھے۔ وہ دونوں ہی چاہے جا رہے تھے اور وہ دونوں ہی چاہ رہے تھے۔ یہ اس شام کی بات تھی جس شام آسمان سے سفید گولوں کی صورت برف گر رہی تھی۔ وہ پہاڑوں پر بنے اسے مٹی کے

گھر کے صحن کے پچھلے حصے میں تھا۔ غازان چند منٹ پہلے گیا تھا اپنے دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرنے۔

وہ یوں ہی برف کو گرتے دیکھ رہا تھا جب اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ گل شاد حسین کو غزل میر کی موجودگی احساس ہو جایا کرتا تھا۔ پاس سے، دور سے، دیکھے، بنا دیکھے۔ وہ بس ہوا کی طرح محسوس ہوتی تھی۔

''بہت خوبصورت لگ رہی ہے ناں یہ برف؟'' اس نے اس کے ساتھ کھڑے ہوتے ہاتھ پھیلایا۔ جس پر برف کے نرم مگر یخ ٹکرے گرنے لگے۔

''تمہارے ساتھ اسے محسوس کرنا زیادہ خوبصورت ہے۔'' وہ اسے دیکھ کر بولا۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ آگے کیا اور اس کے ساتھ جوڑا۔ وہ دونوں ہاتھ اب دعا کی صورت میں تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں برف پڑ رہی تھی۔

''مجھ سے کوئی اظہار کرو غزل۔'' وہ اب برف کو دیکھ رہا تھا۔ درختوں پر برف پڑ رہی تھی۔ وہ سیاہ تھے سفید ہو رہے تھے۔

''کیسا اظہار؟'' غزل مسکرائی۔ مسکراہٹ سے گال سرخ ہوئے۔ وہ چادر میں تھی۔ موٹی، گرم اور نرم چادر۔ غزل میر جرسی یا کوٹ نہیں پہنا کرتی تھی۔

''جو داستانوں میں لکھا جائے۔'' وہ بولا۔ ان دونوں کے ہاتھ برف سے بھرنے لگے تھے، ہاتھ سردی سے جمنے لگے تھے پر وہ متوجہ نہیں تھے۔ جب وہ دونوں ساتھ ہوتے تھے تو باقی ہر شے پس منظر میں چلی جایا کرتی تھی۔ انسان، حیوان، چیزیں، وقت۔

''غزل میر کے دل نے جس واحد انسان کو قبول کیا ہے وہ گل شاد حسین ہے اور جس آخری انسان کو بھی وہ اپنے دل سے نکالنا نہیں چاہے گی وہ گل شاد حسین ہے۔ آپ پر غزل میر کی

جان قربان، انائیں مسترد، قلب ساکن، ہر شے پس منظر۔" غزل میر نے اپنا برف سے بھرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا، دبایا پھر برف دور اوپر کی طرف اچھالی۔ گل شاد حسین نے اسے دیکھا وہ غزل میر تھی، نہیں وہ غزل گل شاد حسین تھی۔ وہ دونوں ساتھ تھے، مسکرا رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ اسے چھیڑ رہا تھا وہ سرخ پڑ رہی تھی۔ وہ ناراض ہو رہی تھی وہ اسے منا رہا تھا۔

پھر وقت بیتا اور بیتتا چلا گیا۔ غزل میر کو گل شاد حسین کے ساتھ وقت کا جیسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ تو اس کے ساتھ جاڑے کی سرد راتوں میں املوک کھاتے ہوئے دنیا جہاں کی باتیں کرتی تھی۔ گرمیوں کے لمبے دن وہ اس کے ساتھ ٹھنڈے درختوں کی ہوائیں محسوس کرتی تھی۔ پہاڑوں پر بنے اس گھر کے قریب بنے غزل کے باغیچے کا پہلا پھول گل شاد حسین کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ اور صرف ایک پھول نہیں ہر پودے پر اُگنے والا پہلا پھول گل شاد حسین کے نام ہوتا تھا۔ پت جھڑ کے موسم میں درختوں کی لمبی قطار کے نیچے چلنا گل شاد حسین کی ہمراہی میں اسے وقت کا اندازہ لگانے بھی نہیں دیتا تھا۔ غزل میر کو مکئی کی روٹی پسند نہ تھی، نہ بنانا اور نہ کھانا۔ گل شاد حسین کے لیے کئی کئی پہر وہ اس مشقت میں لگی رہتی۔ اسے چائے پسند تھی پر محبت نہیں تھی اس سے لیکن گل شاد حسین کی چائے سے محبت اسے بھی اس محبت میں مبتلا کر گئی تھی۔ وہ اب رات میں گل شاد حسین کے ساتھ چائے پیتے دنیا جہاں کی باتیں کرتی تھی۔ ہر طرف گل تھے، ہر سمت گل شاد حسین تھا۔ وہ بولتا غزل خاموش رہتی، وہ کہتا غزل سنتی رہتی۔ وہ چپ ہوتا غزل کو اپنی سماعت پر شبہ ہوتا، وہ کہتا غزل ہنستی رہتی۔ گل شاد حسین پہاڑوں کی غزل پکارتا غزل میر کے گال حیا سے سرخ ہوتے۔ غزل میر نے گل شاد حسین کے ساتھ ہر موسم کا ہر پھل چکھا تھا۔ پھلوں کا ذائقہ اس کی زبان تب چکھتی جب گل شاد حسین اس کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا۔ اگر وقت یہ جان نہیں پایا تھا کہ کون محبوب اور کون عاشق ہے تو غزل میر اور گل شاد

حسین کو بھی کبھی اس بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ ہر دعا میں اس کے لیے خوشیاں مانگتی تھی۔ ہر عید پر اس کے لیے سنورتی تھی۔

☆......☆......☆

"پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں۔"

غزل میر کا خیال تھا ان کی داستان خوشگوار ہے پر ایک روز یہ خیال ہوا میں اڑ گیا ریت کے ذرے کی طرح۔ اس کے گھر میں کس نے بتایا اسے نہیں پتا پر وہ پانی لانے گئی تھی اور دوسرے گاؤں کی کسی لڑکی نے اسے گل شاد حسین کی شادی کے بارے میں بتایا تھا۔

وہ سنبھل بھی نہ سکی تھی۔ مٹی کا مٹکا وہیں ٹوٹ کر گر گیا تھا۔ جس راستے سے وہ گھر آئی تھی اس راستے پر ہر شے نے اسے ترس سے دیکھا تھا۔

"مجھے پتا تھا کبھی نہ کبھی یہ تو ہو گا۔ پر گل شاد حسین کی پہلی بیوی ہماری غزل ہی ہے اور پھر پسند بھی۔ وہ دوسری طرف مجبوری کے تحت گیا ہے۔" اسے ابا کی آواز آئی۔ وہ یاسیت سے کہہ رہے تھے۔ اسے اماں کی سسکیاں بھی سنائی دینے لگیں۔ وہ بنا کچھ کہیں گھر کی پچھلی طرف پڑے پتھر پر بیٹھ گئی۔ نہ آنسو بہایا، نہ زبان سے کچھ کہا بس خالی خالی نظروں سے آسمان کو دیکھا۔ وہ کئی لمحے، کئی منٹ یونہی چہرہ اٹھائے آسمان کو دیکھے گئی۔ نہ آنکھ سے آنسو بہا، نہ دماغ نے کوئی جواب دیا۔ ان نظروں میں کچھ نہ تھا وہ خالی تھیں۔ پر کیا واقعی وہ خالی تھیں؟ وہ اندر بڑھ گئی۔ اپنے کمرے میں آئی تو وہاں غازان کا بستہ رکھا گیا تھا۔ جس کے اوپر اردو کی کتاب تھی اور کاپی بھی، پر اس کی نظریں اس ایک نظم پر ٹھہر گئیں۔ تنہائی۔ وہ ایسی نظم تھی جو اس کے دل کو خوب سمجھتی تھی۔ اسے لگا تھا وہ آئے گا نکاح کے بعد تو ضرور آئے گا۔ کوئی صفائی دے گا، کوئی وضاحت کرے گا۔ وہ شاید اس سارے قصے کی ہی نفی کر دے۔ لوگ تو ویسے بھی

سنی سنائی باتیں آگے پھیلاتے ہیں۔ لیکن وہ نہیں آیا، شام رات میں ڈھلی اور رات گہری ہوتی گئی۔ اور یوں کئی شامیں راتوں میں ڈھلتی گئیں لیکن وہ نہیں آیا۔ وہ لالٹین لیے اس جگہ آ گئی جہاں نکاح کے بعد وہ گل شاد حسین کے ہمراہ بیٹھی تھی۔ تب جب اسے لگا تھا اسے ایسے شخص سے نوازا گیا ہے جو صرف اسی کا ہے۔ اور پھر کئی راتیں وہ وہیں بیٹھی رہی۔

''راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا۔''

وہ صبح کی لو پھوٹتی تو منڈیر پر بیٹھ جاتی۔ ہر دور سے آتے شخص کو دیکھ کر اسے لگتا اب بس انتظار ختم۔ وہ آ گیا ہے اور اب کچھ کہے گا۔ لیکن وہ کسی اور جہاں کا مسافر ہوتا۔ اور یوں غزل میر کی آنکھیں خالی لوٹ آتیں۔ کتنی مرتبہ اسے لگا بس اب وہ روئے گی۔ اب اس کا دل پھٹے گا، اب دماغ کچھ اس ایک شخص کے خلاف سوچے گا جو بے وفا تھا لیکن نہیں غزل میر کے وجود سے روح تک اگر تو انتظار تھا تو بس گل شاد حسین کی موجودگی کا۔ اور اس اعتراف یا انکار کا جو اس کی زبان سے ہونا تھا۔

''ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ۔''

وہ اکثر رات میں بیٹھے بیٹھے کہیں دور کسی اور جہاں کی مکین ہو جاتی جہاں صرف غزل میر اور گل شاد حسین ہوتے۔ سردیوں کی سرد راتوں میں اور تیز ہواؤں کے بیچ جہاں لالٹین کی زرد روشنی بھی کپکپاتی وہاں وہ بغیر کسی اثر کے بیٹھی رہتی۔ بغیر کسی چادر کے۔

''اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھاؤ مئے و مینا و ایاغ۔''

پھر وہ آیا ایک دن اور اس دن جیسے غزل میر کی ساری حسیات جاگ اٹھیں۔ وہ جو آنسو

عرصہ ہوا رک چکے تھے پھر سے بہنے لگے تھے۔ وہ سامنے جب آیا تھا تو دل نے کئی لمحے ششدر سا اسے تکا تھا۔ اور غزل میر کو یہ ماننے میں مشکل ہوئی کہ عرصہ بعد، محبوب کی بیوفائی کے بعد اس کی بیگانگی کے باوجود یہ دل ہنوز پہلے دن کی طرح گل شاد حسین کے لیے دھڑکتا ہے اور بس اس کی ہمراہی چاہتا ہے۔ اور گل شاد حسین کے منہ سے سننے والی بات جیسے کوئی خنجر تھے جو دل کو چیر کر رکھ رہے تھے۔ وہ اس برستی بارش میں روتی ہوئی گھر کی طرف آ گئی تھی۔ اس کی ماں دروازے پر کھڑی ان دونوں کی راہ تک رہی تھی اسے اکیلا آتے دیکھ کر جیسے کسی انہونی کا پتا ملا تھا انہیں۔ غزل میر بھاگتی ہوئی آئی اور ماں سے چمٹ کر اونچی اونچی آواز میں دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

''وہ ایک شخص جسے غزل میر نے اپنے دل کے سب سے اونچے خانے پر رکھا تھا اس نے آپ کی بیٹی کو دو کوڑی کا کر دیا اماں۔'' وہ روتی جاتی کہتی جاتی۔

''اماں! میں کیا کروں، میرا دل پھٹ رہا ہے۔ وہ میرے ساتھ ایسے کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ غزل میر کی جگہ کسی اور کو کیسے سونپ سکتے ہیں؟ اماں وہ گل شاد حسین اور غزل میر کی داستان میں کسی تیسرے کو کیسے شامل کر سکتے ہیں۔ ہم تو ایک روح تھے یہ تیسرے کا گزر ہم میں کیسے ہو سکتا تھا؟ کیسے ہو گیا ہے؟'' اس نے کہا اور پھر روتے روتے وہیں بیٹھتی چلی گئی۔

''غزل؟'' ابا نے آ کر اماں سے اسے الگ کیا پھر خود سے لگایا۔ ان کا دل اپنی بیٹی کے آنسو سے کٹتا تھا۔

''آپ نے کہا تھا اس کی خدمت کرنا، اس کا ساتھ نبھانا، اس کے ساتھ مخلص رہنا، ابا! میں نے ماں باپ کو ایک طرف کر دیا ان کی اطاعت میں، ان کے ہمراہ چلی ہر قدم کسی دوسرے کو دیکھنا دور سوچنا، دور تصور تک نہ کیا میں نے پھر بھی، پھر بھی ابا وہ شراکت کر گیا۔

محبت میں شراکت کی سزا کیا ہوتی ہے؟" وہ اسی طرح ہذیانی انداز میں چیختی رہی، چلاتی رہی۔ اس رات وہ ساری رات چیختی رہی تھی۔ پاگلوں کی طرح۔

"اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو

اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔"

اس نے اس کی راہ تکنا چھوڑ دیا۔ دوسرے دن سے وہ بے حس ہوتی گئی۔ ہر انسان سے، ہر موسم سے، ہر شے سے، ہاں سوائے ایک اس شخص کے سوائے گل شاد حسین کے۔ وہ آئے گا، انکار کرے گا شراکت داری کی نفی کرے گا اور اس سے اظہار محبت کرے گا اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا یہ سارے خواب جیسے خواب ہی رہ گئے تھے۔ اسے پتا تھا اب وہ نہیں آئے گا۔

کھانا پینا نہ ہونے کے برابر ہو گیا، ماں باپ سے گفتگو قلیل تر ہو گئی، بھائی سے پیار ماند پڑ گیا، سکھیوں سے ہنسی مزاح کا دل اٹھ گیا، رونقوں نے غزل میر کو متاثر کرنا چھوڑ دیا۔ وہ جو محفلوں کی جان ہوتی تھی اب تنہائی اس کی سکھی بن گئی۔ وہ جس کے بولنے سے سارا زمانہ سیراب ہوتا تھا اب عرصہ ہوا لوگوں کو اس کی آواز سنے۔ وہ جو ہنستی تھی تو سارا کشمیر مسکراتا تھا اب اس کے نہ کھلکھلانے پر کشمیر غموں میں ڈوب گیا۔ وہ جو بہار تھی جنگلوں کی، وہ جو گل تھی باغیچوں کی وہ جو غزل میر تھی پہاڑوں کی وہ اب نہیں رہی تھی وہ کہیں کھو گئی تھی۔

اب وہ روتی اور کئی کئی پہر روتے جاتی۔ اب وہ جو چپ ہوتی تو سالوں خاموشی سادھ لیتی۔ ماں باپ اسے سمجھاتے، نصیحتیں کرتے، ڈانٹتے ڈپٹتے پر وہ بنا اثر لیے بیٹھی رہتی۔ غازان اپنی ددو کو دیکھتا اور اس کے آنسو نہ رکتے بہن کا دکھ ایک مضبوط انسان کو رلا دیتا ہے۔

☆......☆......☆

دل جو کبھی پُرسکون ہوا کرتا تھا اب دل زار رہنے لگا۔ ایسا دل جو ٹوٹا بکھرا ہو۔ غزل میر جو خوبصورتی کی مثال ہوتی تھی اب بس وہ روتی بکھری رہتی۔

''کل گل شاد حسین آ رہا ہے۔'' وہ جو چہرہ جھکائے کسی اور دنیا میں پہنچی ہوئی تھی جھٹکے سے سر اٹھایا۔ حیرانی بنتی تھی۔ دل نے آج بھی اس کی آمد کا سن کر ہلچل مچائی تھی جیسے وہ ہمیشہ اس کی آمد کا انتظار کرتا تھا۔ ہمیشہ اس کی آمد کا منتظر رہتا تھا۔

''کیوں؟'' اس کے لب آہستہ سے ہلے۔

''تجھے لینے۔'' امی نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں جنگل میں جڑی بوٹیاں ڈھونڈنے آئی تھیں اب ایک پتھر پر بیٹھی تھیں۔ دھوپ خوب چمکدار تھی لیکن وہ سائے میں بیٹھی تھیں۔ امی اسے زبردستی لائی تھیں تاکہ اس کا دھیان بٹے۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔ تو کیا وہ اس کے ساتھ جائے گی؟ اسے یاد آیا کتنے خواب دیکھتے تھے کہ جب وہ ساری دنیا کے سامنے اس کے پہلو میں بیٹھے گی تو لوگ کس قدر رشک سے اسے دیکھیں گے۔ وہ جو اس کے پہلو میں چلے گی تو لوگ کیسے حیران ہوں گے۔ اب حالات مختلف تھے۔ اسے یاد آیا وہ اب اس کا نہیں تھا۔ محبوب نے عاشق کو فریب دیا تھا، بے وفائی کی تھی۔

''میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ بولی تو اسے اپنی آواز اپنی نہ لگی۔ دل کے ہزار ٹکڑے ہوئے۔ جسم شل ہوا۔

''تو طلاق لوگی؟ تو اگر طلاق لوگی بھی تو ہم تمہارے ساتھ ہیں غزل۔'' امی نے اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ آواز میں محبت ہی محبت تھی غزل کے لیے فکر بھی۔

''امی۔'' غزل میر نے دہل کے انہیں دیکھا۔ وہ جو سوچ اس کے دماغ میں کبھی نہیں آئی تھی۔ شوہر کی بیوفائی اور دھوکے کے بعد بھی اس کی ماں نے کتنی آسانی سے یہ بات کہہ دی

تھی۔ غزل میر کو لگا اس کی روح کھینچی گئی ہو۔ دماغ کی شریان پھٹ جانے کو ہوئی۔

''اس نے غلطی کی مجبوری میں کی تھی۔ وہ شادی اس کی مجبوری تھی غزل۔'' اماں نے اب کی بار طلاق کا لفظ نہیں لیا۔

''مرد مجبور نہیں ہوتا اماں آپ یہ مت کہیں۔'' اس نے دکھے دل سے کہا۔

''ہوتا ہے۔ مرد بھی انسان ہے اور انسان مجبور اور بے بس دونوں ہوتے ہیں۔''

''کم از کم فریب دینے کے معاملے میں کوئی انسان مجبور نہیں ہوتا۔ دھوکہ انسان کے اپنے بس میں ہوتا ہے۔ وہ چاہے دے چاہے نہ دے۔'' غزل کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

''ہم ساری زندگی تمہیں اس کے نام نہیں بٹھائیں گے۔ یا تو تم اسے قبول کرو اس کی دوسری بیوی کے ساتھ یا پھر طلاق لے لو۔'' اماں نے کہا پھر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''اچھی طرح سوچ لو کل تک۔ تم ہمارے لیے بہت اہم ہو، ہماری بیٹی ہو جو فیصلہ کرو گی ہم اس میں تمہارے ساتھ ہیں۔'' وہ کہتے ساتھ آگے بڑھ گئیں جب کہ وہ وہیں بیٹھی رہی۔ اس شام غزل میر نے دوبارہ سے سب کچھ سوچا سرے سے۔

اسے زیادہ برا کیا لگا تھا؟ گل شاد حسین کی دوسری شادی یا اسے دھوکہ دے کر دوسری شادی؟

جواب صاف تھا۔ دونوں چیزیں دل چیرنے والی تھیں لیکن دھوکہ، فریب کاری، زیادہ زور کی لگی تھی۔

''کیا غزل میر گل شاد حسین کے نام کے بغیر رہ سکتی ہے؟ کیا غزل میر کسی دوسرے شخص کو گل شاد حسین کی جگہ رکھ سکتی ہے؟'' اس نے خود سے پوچھا اور لمحے کا انتظار کیے بغیر جواب نہیں کی صورت میں ملا تھا۔ کم از کم اس دنیا میں ایسا ممکن نہیں تھا۔

وہ گل شاد حسین سے ناراض تھی اور اگلی کئی صدیاں ناراضگی میں گزار سکتی تھی۔ لیکن گل شاد حسین سے علیحدگی کسی صورت ممکن نہ تھی۔ اس نے کئی بار سوچا لیکن اسے ایک لمحہ وہ یاد نہیں آیا جب اسے گل شاد حسین سے ناپسندیدگی یا نفرت ہوئی ہو۔ وہ محبت کے اوائل دنوں کی طرح آج بھی اپنی جگہ پر موجود تھا۔

''میں کل گل شاد حسین کے ساتھ جاؤں گی۔ کم از کم اس صدی میں یہ ممکن نہیں کہ میں اس شخص کے بنا رہ سکوں جو میرا سکونِ قلب ہے۔'' وہ ہلکے سے بڑبڑائی۔ اور پھر اطمینان سے گھر کی جانب چل پڑی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اسے اس کی بیوفائی کے لیے معاف کر چکی تھی یا پھر شراکت داری کے لیے لیکن وہ اس کے ساتھ جائے گی اس دنیا میں یہ طے تھا۔ کئی صدیوں بعد اس شام غزل میر نے اپنے ہاتھوں سے کھانا بنایا، غازان سے ڈھیر ساری باتیں کیں اور اماں ابا سے لاڈ اٹھوایا۔ عرصے بعد وہ مسکرائی اور اس کے مسکرانے سے یوں لگا جیسے کشمیر کے سارے پہاڑ مسکرائے ہوں۔ وہ ہنسی تو یوں لگا خزاں کے دور میں بہار سی پھیل گئی ہو۔ وہ بولی تو پرندوں نے رک کر اسے دیکھا۔ اگلے دن اس نے عرصے بعد گل شاد حسین کے دیئے گئے کپڑوں میں سے کپڑے نکال کر پہنے۔ گل شاد حسین نے سرخ کا ایسا کوئی شیڈ نہیں چھوڑا تھا جو اسے لے کر نہیں دیا ہو۔ وہ کہتا تھا۔

''میں نے آج تک سرخ کسی پر اتنا اچھا ہوا نہیں دیکھا جتنا پہاڑوں کی غزل پر، میری غزل پر۔ سرخ رنگ کو دیکھ کر لگتا ہے وہ بس تمہارے لیے بنا ہے۔''

اور اس صبح اس نے سرخ ہی پہنا تھا۔ ہاتھوں پر عرصے بعد مہندی لگوائی تھی امی سے۔ اسے مہندی پسند نہیں تھی لیکن گل شاد حسین کو اس کے ہاتھوں پر مہندی لگی دیکھنے کی خواہش ہوئی اور پھر غزل میر نے خود کو ہر بار اس کی آمد پر مہندی لگاتے پایا۔

"تمہارے ہاتھوں پر مہندی ایسی لگتی ہے جیسے کسی ماہر مصور کی مصوری۔" وہ اسے کہا کرتا تھا۔ اس نے اس دن چوڑیاں بھی پہنی تھیں، کاجل بھی لگایا تھا اور ہونٹوں کو بھی سرخ رنگ سے سجایا تھا۔ دوپٹہ سر پر ٹکائے آنکھیں جیسے اس کی راہ تک رہی تھیں۔

"آج جب میں گل شاد حسین کی آمد کا انتظار کر رہی ہوں تو میرا دل مجھ سے بس ایک ہی حسرت کر رہا ہے اور پھر ضد پر اڑا ہے۔" وہ چارپائی پر بیٹھی ڈائری میں الفاظ بکھیر رہی تھی۔

"قلب کہہ رہا ہے اسے معاف کر دو، اس ایک شخص کو جو تمہاری کل کائنات ہے۔ دل حمایت کر رہا ہے۔ وہ شروع سے ایسا ہے وہ شروع سے اس کی طرف ہے۔ میرا دل کب میرے بس سے باہر ہوا اور گل شاد حسین کا اسیر ہوا یہ تو پتا ہی نہیں چلا۔ دل آخر کیوں اپنا نہیں رہتا وہ محبوب کا کیوں ہو جاتا ہے؟" اس نے پوچھا کس سے؟ خود سے؟ ڈائری سے؟ وقت سے؟ یا پھر قدرت سے۔

"میں جب بھی دعا کرتی ہوں نماز کے بعد پہلا نام آج بھی اسی شخص کا ہوتا ہے جو انت الحیات ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کوئی آپ کو تکلیف دے اور پھر بھی دعاؤں میں سرِ فہرست ہو؟ محبوب اور عاشق کا یہ کیسا معمہ ہے جو عقل والوں کی سمجھ سے بالاتر ہے اور دیوانے اسے بوجھ لیتے ہیں؟" چند لمحے دیوار سے ٹیک لگائے اس نے سوچا۔ آنکھیں مسکرائیں۔ عرصہ بعد جیسے وہ پُرسکون تھی۔

"محبوب اور عاشق کی یہ کیسی محبت ہے جو ہزار غلط فہمیوں، لاکھوں دوریوں اور کروڑوں ناراضگیوں کے بعد بھی کم نہیں ہوتی، ختم نہیں ہوتی، ماند نہیں پڑتی؟ بڑھتی چلی جاتی ہے۔" اس نے لکھا۔

"میں گل شاد حسین سے محبت کرتی ہوں، کرتی تھی اور کرتی رہوں گی۔ گل شاد حسین کو

غزل میر سے زیادہ کوئی نہیں چاہ سکتا۔ غزل میر کے دل پر پہلی بار الہام کی طرح اترنے والا شخص گل شاد حسین تھا اور آخری شخص جو اس کی زندگی کا محور ہو گا وہ بھی گل شاد حسین ہی ہو گا۔"

غزل میر نے ڈائری بند کی، اپنے صندوقچہ میں رکھی اور باہر آ گئی۔ غازان سے ہنس کر کچھ کہا پھر اماں کو دیکھا تو اماں سے جانے کس شے کی فرمائش کی، پھر تھوڑا آگے بڑھی، ابا نظر آئے۔ ابا کو محبت سے دیکھا۔ پھر تھوڑا نیچے اتر آئی تا کہ دیکھ سکے گل شاد حسین آیا۔ وہ بے دھیانی میں مسکراتے ہوئے چل رہی تھی، جب اس کا پاؤں کسی نرم شے کے اوپر رکا، اس نے نیچے جھانکا، وہ سانپ کی دم تھی اور پھر اسے اپنی ٹانگ پر کوئی خنجر چبھتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ نیچے گر پڑی۔ درد تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے سانس لینے کی کوشش کی پر سانس گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ اس کی چیخ سے بھاگتا ہوا غازان اس کے پاس آیا۔ غازان کی نظریں اس سانپ پر گئیں اور پھر لمحے بھر کو اس بھائی کا دل رکا۔ اس نے غزل کو جب بانہوں میں لیا تو غزل میر نے ایک آخری ہچکی لی اور یہ دنیا چھوڑ کر رخصت ہو گئی۔

ڈائری کے آخری صفحے ہنوز کھلے تھے۔ گل شاد حسین نے ان آخری صفحوں پر لکھی شاعری دیکھی۔

"میرا عشق ہو
تیری ذات ہو
پھر حسن عشق کی بات ہو
کبھی ہم ملیں ملاقات ہو
کبھی تو ہو چپ
کبھی میں ہوں چپ

کبھی ہم دونوں کی بات ہو

کبھی میں تیرا کبھی تو میرا

کبھی صعوبتیں، کبھی رنجشیں

کبھی دوریاں، کبھی قربتیں

کبھی الفتیں، کبھی جیت ہو

کبھی ہار ہو، کبھی یاد ہو

کبھی تیرا دیدار ہو

صرف میرا عشق ہو

تیری ذات ہو

کوئی ایسی بھی ملاقات ہو۔

اور پھر گل شاد حسین اس شام دھاڑیں مار مار کر رویا تھا۔ اسے یہ فکر نہیں تھی وہ مرد ہو کر ایک عورت کے لیے رو رہا ہے۔ وہ بس رو رہا تھا کیونکہ اس کی غزل میر اس سے چھن چکی تھی۔ کئی عرصہ پہلے وہ اسے چھوڑ گئی تھی، عرصہ بعد اسے پڑھا اور لگا آج پھر وہ دوسری مرتبہ اسے چھوڑ گئی ہے۔ وہ ساری شام وہیں بیٹھا روتا رہا تھا۔ محبت، گلٹ، بے بسی، کیا جذبہ تھا جو وہاں مارگلہ کی پہاڑی پر بیٹھے گل شاد حسین نے محسوس نہ کیا ہو۔

پھر اس نے ڈبے میں پڑی آخری چیز دیکھی۔ وہ خطوط تھے اور گل شاد حسین جانتا تھا یہ اس کے دیئے خطوط تھے۔ اور ان خطوں کے پیچھے کسی کی فرمائش تھی۔ یہ بات اسے پھر سے اذیت میں مبتلا کر گئی تھی۔

''آپ میرے لیے خطوط لکھا کریں وہاں سے؟'' وہ دونوں بنجوسہ کی مصنوعی جھیل کے

کنارے بیٹھے تھے جب غزل نے کہا تھا۔

''وہ کیوں؟'' گل شاد حسین مسکرایا۔

''آپ کو دیکھ نہیں سکتی آپ کو سن نہیں سکتی میں تب لیکن آپ کو پڑھ تو سکتی ہوں ناں، خط پر آپ کی موجودگی محسوس تو کر سکتی ہوں ناں۔'' اس نے جھیل سے رخ موڑ کے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ گل شاد حسین چند لمحے اسے دیکھتا رہا اور پھر بے حد نرمی سے سر تسلیم خم کیا۔

''جیسا آپ کا حکم جانِ من۔'' غزل اس کے انداز پر سرخ پڑی تھی۔

''تم میرے خطوں کا جواب دیا کرو گی؟'' گل شاد حسین نے اب کی بار اپنا سر اس کی گود میں رکھتے چت لیٹتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس کا دوپٹہ اپنے چہرے پر لٹکایا۔ دھوپ سے بچنے کی کوشش کی۔ سفید دوپٹہ دھوپ کی تمازت سے چمک رہا تھا۔

''اونہوں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''وہ کیوں؟'' اب کی بار لہجے میں حیرت تھی۔

''میرا اپنا تو ایک ہی ہے شروع سے ہمیشہ سے۔ میں تو ایک جگہ ٹھہری ہوں آپ ہیں جو دنیا دنیا پھرتے ہیں۔ بہتے پانی کی طرح ہیں۔ یہ خطوط جو آپ بھیجیں گے یہ آپ کو یاد دلائیں گے کہ کشمیر کے پہاڑوں میں آپ کا ایک رشتہ ہے جو آپ کی واپسی کا منتظر ہے، دنیا میں چاہے جہاں چلے جائیں واپسی آپ کی پہاڑوں پر ہی ہونی ہے اور ہونی چاہیے بھی۔ کہیں اونچی اونچی عمارتوں کو دیکھ کر ان کی بھول بھلیوں میں کھو کر آپ کو پہاڑ اور پہاڑوں پر رہنے والے بھول ہی نہ جائیں۔'' غزل نے اپنا دایاں ہاتھ دوپٹے کے اوپر سے اس کے بالوں میں پھیرا۔

''مجھے ہر بار آپ کی موجودگی کہاں پر ہے اس کی خبر ہو۔''

''اور کس زبان میں لکھوں؟'' اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"وہ جو غزل کی زبان ہے جسے وہ ہر زبان پر فوقیت دیتی ہے۔" وہ بھی مسکرائی۔

اور پھر وہ نومبر کی اور سردیوں کی پہلی برف تھی جس میں بیٹھ کر غزل نے اس کا پہلا خط بے حد پیار سے آنسوؤں کے درمیان کھولا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب سب اچھا تھا جب ان دونوں کے درمیان کوئی تیسرا نہ تھا۔ خط کے شروع میں ہمیشہ لکھا ہوتا تھا۔

"پہاڑوں کی غزل میر کے نام!"

اور خط کا اختتام ان لفظوں کے ساتھ ہوتا تھا۔

"تمہارا فقط تمہارا گل شاد حسین۔"

یہ دو جملے اردو میں ہوتے یا انگریزی میں لیکن درمیان کا وہ حصہ جس میں ساری روداد ہوتی، وہ پہاڑی زبان میں ہوتی تو کبھی کشمیری زبان میں۔ کبھی وہ رومن انگریزی میں اور کبھی رومن اردو میں لکھی ہوتی۔

"زندگی کے سفر میں گزر جاتے ہیں

جو مقام وہ پھر نہیں آتے

پھول کھلتے ہیں لوگ ملتے ہیں مگر

پت جھڑ میں جو پھول مرجھا جاتے ہیں

وہ بہاروں کے آنے سے کھلتے نہیں

کچھ لوگ جو ایک روز بچھڑ جاتے ہیں

وہ ہزاروں کے آنے سے ملتے نہیں۔"

(نامعلوم)

☆......☆......☆

صبح دن میں ڈھل چکی تھی، بارہ کس وقت بجے اسے ہوش ہی نہ رہا۔
''تمہیں پتا چلا محبت کا تیسرا درجہ کون سا ہوتا ہے؟'' وہ جو آنکھوں میں آئی نمی رخ موڑ کے پونچھ رہا تھا، گل شاد حسین کی آواز سے چونکا۔ پھر ان کی سمت دیکھا۔ وہ ہولے سے مسکرائے، ایسی مسکراہٹ جسے دیکھ کر رونا آئے۔
''محبت کا تیسرا درجہ قدر ہے وہ جو سب سے اہم اور سب سے کٹھن ہے۔'' عیسیٰ نے کہیں دور خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ گل شاد حسین نے اثبات میں سر ہلایا۔
''محبت کا تیسرا درجہ قدر ہے۔ گل شاد حسین اور غزل میر نے محبت کے دو درجے بڑی آسانی سے پار کردیئے کیونکہ ان میں زیادہ کوشش ان کی نہیں تھی صرف کردار ان کا تھا اور جہاں انہوں نے کوشش کرنی تھی وہاں وہ ناکام ٹھہرے۔ گل شاد حسین اور غزل میر نے محبت کر لی اور اس کا حصول بھی لیکن اس کی قدر نہ کر سکے، اپنے رشتے کا پاس نہ رکھ سکے۔'' گل شاد حسین اٹھ کھڑے ہوئے، پھر ہاتھ آگے بڑھایا۔ عیسیٰ نے چند لمحے انہیں دیکھا پھر ہاتھ تھام لیا۔
''قدر ہر رشتے میں، ہر شے میں سب سے زیادہ معنی رکھتی ہے۔ وقت صحیح ہو یا غلط، آزمائشیں سہل ہوں یا مشکل لیکن ہمیں جس چیز کو سختی سے تھامنا ہوتا ہے وہ ہوتا ہے صبر اور قدر۔'' انہوں نے قدم آگے بڑھانے چاہے پر عیسیٰ نے انہیں روکا۔ دونوں نے چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھا پھر عیسیٰ زبیر ایک قدم آگے آیا اور بے حد نرمی سے گل شاد حسین کو گلے سے لگایا اور ان کی پیٹھ تھپکی۔ وہ دونوں قدموں میں برابر تھے۔ گل شاد حسین لمحے بھر کو تھم گیا۔ بے فکری کے دور سے آفتوں کے دور تک ساتھ نبھانے والا اپنا ایک پرانا دوست یاد آیا تھا۔ بے تحاشا اور بے پناہ۔

''شہریار۔'' ہولے سے ان کے لب پھڑ پھڑائے۔ پھر وقت نے انہیں تھم کر دیکھا تھا جن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر چکی تھیں۔

''یہاں نہیں تو عالم ارواح میں خدا آپ کو اور غزل میر کو ضرور ملائے گا۔ یہاں کا سفر ویسے بھی فانی ہے وہاں ابدی زندگی میں آپ دونوں کا ساتھ اللہ آپ کے نصیب میں کرے۔''

اس نے آہستہ سے کہا۔ گل شاد حسین نے آہستہ سے سر اثبات میں ہلایا۔ اور پھر وہ دونوں الگ ہو گئے۔ دونوں خاموشی سے چلتے ہوئے اب اپنے آشیانوں کی طرف تھے۔ کیا ان کی ملاقات پھر سے ہو گی یا پھر یہ آخری ملاقات تھی؟

☆......☆......☆

(میرا نام نگہت گل شاد حسین ہے اور میں اپنے شوہر کی دوسری بیوی ہوں۔ میرا بڑا بیٹا فوج میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہے، جب کہ دوسرا بیٹا ڈاکٹر ہے اور میں خود ایک بوتیک کی مالک ہوں۔)

دو بجے کا وقت ہو گا جب وہ کمرے سے باہر آئی اور کچن کی جانب چلی آئی۔ اسے پیاس لگ رہی تھی۔ رات کے بعد عیسیٰ کی دوبارہ کال نہیں آئی تھی۔ لیکن بارش کے بعد نکلی دھوپ کی مانند السماء نور کے چہرے پر بے تحاشا سکون تھا، چمک تھی۔ وہ آگے آئی، وہاں بڑے مگ رکھے گئے تھے جن سے پانی پیا جاتا تھا۔ انس کہتا تھا۔

''ہم اتنے غریب ہو گئے ہیں ہمارے پاس پانی پینے کے لیے گلاس تک موجود نہیں ہیں۔ ہم مگ میں پانی پیتے ہیں۔'' وہ انس کی بات یاد کر کے ہنسی۔ پھر پانی پیا اور باہر آ گئی۔ اپنے کمرے میں جاتے ہوئے اس کا موبائل بجا۔ اس نے کال آئی ڈی دیکھی۔ E نام واضح تھا۔ عیسیٰ زبیر کی دوسری مرتبہ کال دیکھنے کے باوجود دل پہلے کی طرح دھڑکا تھا۔ وہ جو محبت نہیں تھا

سراپا سکون تھا وہ اس کا شوہر عیسیٰ زبیر ہی تھا۔
(میں آج ایک کامیاب عورت ہوں تو اس کی وجہ میرا شوہر ہے جس نے میرے دو بچوں کو باپ کی طرح پالا اور میری یعنی اپنی دوسری مجبوری کی بیوی کی خبر گیری کی۔ میرے دونوں بیٹے آج بھی اپنے باپ کو فوجی انکل کہتے ہیں لیکن اب ان کے جذبات بدل گئے ہیں۔ دل انہیں کب کا باپ مان چکا ہے۔)
دوسری طرف صدر کی ایک دکان پر بیٹھتے ہوئے عیسیٰ زبیر نے اپنی بیوی کی کال اٹینڈ کرنے کا انتظار کیا۔ اور بالآخر تا خیر سے لیکن جواب مل چکا تھا۔ صبر کا پھل میٹھا تھا۔
''السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟'' عیسیٰ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ باہر دور کہیں ایک بچہ کاٹن کینڈی لیے مختلف جگہوں پر جا رہا تھا۔
''وعلیکم السلام! الحمدللہ آپ کیسے ہیں؟'' اس نے کمرے میں اپنی کتابوں کے پاس آ کر پوچھا۔ چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ دایاں ہاتھ کان سے لگا تھا جب کہ بایاں ہاتھ کتابوں کو دھیرے دھیرے چھو رہا تھا۔ وہ اس کے رنگ میں رنگ رہی تھی؟ اب حال پوچھنے پر وہ عیسیٰ زبیر کے جیسا جواب دیا کرتی تھی؟ اس نے دل میں سوچا۔ وہ اس کے لفظوں کو خود کی زبان سے ادا کیا کرتی تھی۔
''الحمدللہ...... کہیں باہر کھانا کھائیں؟'' عیسیٰ نے پوچھا۔ کاٹن کینڈی والے بچے کے پاس بس دو کینڈیز رہ گئی تھیں۔ آج اس کا دن اچھا تھا۔ آج سب کا دن ہی اچھا تھا۔
(میری پہلی شادی میری پسند کی نہ تھی۔ اور پھر شوہر نے جلد ساتھ چھوڑ دیا تو سوائے چند ایک جذبے کے میں اپنے شوہر کے لیے کچھ محسوس نہیں کر سکی۔ میری دوسری شادی بھی پسند کی نہ تھی لیکن مجھے یہ بات کہنے میں کوئی دقت نہیں کہ مجھے اپنے شوہر گل شاد حسین سے بہت محبت

ہوگئی ہے۔ مجبوری کب محبت میں بدلی میں نہیں جانتی، لیکن مجھے محبت ہوگئی ہے اس شخص سے جس کی میں دوسری بیوی ہوں اور اس شخص سے جس کی زندگی میں محبت نامی خلا اس کی پہلی بیوی یعنی غزل میر پُر کرتی ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود مجھے فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ شخص مجھ سے محبت نہیں کرتا لیکن مجھے ہر خوشی صرف اسی کی وجہ سے ملی ہے۔ وہ جو مجھے خدا کا گھر دکھالایا، وہ جو مجھے یعنی اپنی بیوی کو اس کے حقوق سے نوازتا ہے، وہ یعنی جو سراپا محبت ہے وہ جو یعنی میرے یتیم بچوں کا باپ بن گیا ہے۔)

''کھانا تو میں نے کھالیا ہے۔'' اس نے درمیان میں سے کوئی کتاب نکالی۔ اور پھر درمیان میں سے ہی کھولی۔ وہ کتاب آب حیات تھی عمیرہ احمد کی کتاب۔ صفحے پر لکھے الفاظ دیکھتے ہوئے اس کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔ بنا لب ہلائے الساء نے وہ چند جملے پڑھے جن میں خانہ کعبہ کے آگے بیٹھے امامہ اس سے اظہار محبت کرتی ہے، اپنی وفاداری کا یقین دلاتی ہے۔ عیسیٰ زبیر نے چند لمحے سوچا۔

''آئسکریم کھانے چلیں پھر۔'' پھر بولتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ بچے کے پاس گیا۔ دونوں کاٹن کینڈی کے پیسے اسے پکڑائے۔

''انس سے منتیں کر کے آئسکریم منگوائی تھی تھوڑی دیر پہلے وہی کھائی تھی۔'' الساء نے کتاب بند کر دی۔ اب وہ پھر سے دروازے کی سمت بڑھ رہی تھی۔ عیسیٰ زبیر نے ایک کاٹن کینڈی بچے کو واپس دی اور پھر اشارے سے اس سے کہا۔

''یہ تمہارے لیے۔''

بچے کی آنکھیں چمکیں، چہرہ مسکراہٹ سے سجا اور وہ شکریہ کہتے چلا گیا۔ عیسیٰ نے الساء کی بات سنی۔ چند لمحے وہ پریشانی سے سوچتا رہا۔ اسے پتا ہی نہیں تھا لڑکیوں کو کیا پسند ہوتا ہے۔

چند لمحے چپ رہنے کے بعد اس کی آنکھیں چمکیں۔

''ہم کسی بک سٹور پر چلیں؟ آپ کو کتابیں دلوانے کا دل کر رہا ہے آپ کے شوہر کا۔'' اب کی بار بولا تو لہجے میں شرارت تھی۔ دوسری جانب السا ءہنس پڑی۔ کھلکھلا کر، سرشاری سے۔

''گول گپے بھی کھلاؤں گا۔'' چند لمحے بعد عیسیٰ نے سوچتے ہوئے مزید کہا۔ السا ءنور بنا کوئی جواب دیئے اسی طرح ہنستی رہی۔

''آپ کو اپنی بیوی کو باہر لے جانے کے لیے کوئی وجہ ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے عیسیٰ۔ میں آپ کے ساتھ بنا کسی وجہ کے بھی کہیں بھی جا سکتی ہوں۔'' وہ اب کے بولی تو چہرے پر شرارت تھی۔ عیسیٰ زبیر کا چہرہ سرخ ہوا پھر ہولے سے ہنس دیا۔

''لیکن اب آپ آفر کر رہے ہیں تو مجھے کتابیں خریدنے اور گول گپے کھانے میں کوئی مسئلہ نہیں۔'' وہ ہنوز شرارت سے بولی۔

''پندرہ منٹ بعد میں آتا ہوں آپ تیار ہو جائیں۔'' عیسیٰ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا پھر کال کٹ کر دی۔ سیاہ آنکھیں عرصہ بعد مسکرائی تھیں اپنی مکمل چمک کے ساتھ پُرسکون انداز میں۔

(میں نے اپنے پہلے شوہر کے ساتھ بھی مخلصی سے نبھائی تھی اس کی زندگی میں اور اب اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ بھی مخلص رہی ہوں، ہاں البتہ اب کی بار ایک اور جذبہ ہے جس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اس کا اسم محبت ہے۔ میرا بڑا بیٹا مجھ سے پوچھتا ہے، ''امی! آپ کو دکھ نہیں ہوتا جب آپ فوجی انکل سے مخلص ہیں اور وہ نہیں۔ وہ آپ سے محبت نہیں کرتے۔'' تو میں ایک ہی جواب دیتی ہوں۔ ''تمہارے فوجی انکل مجھ سے وفاداری

نبھاتے ہیں، مجھے تحفظ دیتے ہیں، اور عزت کرتے ہیں ہاں البتہ اتنے سب جذبوں کے ساتھ اگر وہ محبت نہ بھی دیں تو مجھے فرق نہیں پڑتا۔ کم از کم اتنا تو میں کر سکتی ہوں اپنے شوہر کے لیے کہ ایسی چیز کی خواہش نہ کروں جو چیز میرے شوہر کے بس میں نہیں۔" اور یہ واقعی سچ تھا۔)

چند منٹ لگے تھے اسے تیار ہونے میں۔ سفید کڑھائی والی قمیض پہنے ساتھ ہم رنگ شلوار پہنے وہ اب حجاب درست کر رہی تھی، جو سفید دوپٹے سے کر رکھا تھا۔ بڑی سی سفید شال بھی کندھوں پر تھی۔ لب ہلکے گلابی تھے اور آنکھوں میں مسکارا، گالوں پر کچھ اپنی چمک تھی جہاں وہیں بلش آن سے مزید خوبصورت لگ رہے تھے۔ وہ ہلکے پھلکے میک اپ میں اچھی لگ رہی تھی۔ پیروں میں سول کی چپل تھیں، ان کا رنگ بھی سفید تھا۔ جس وقت وہ موتیوں والا سفید بیگ لیے دروازے میں آئی، انس جو کمرے سے نکل رہا تھا اسے دیکھ کر رکا پھر اس کی طرف آیا۔

"کہاں جا رہی ہو وہ بھی اتنا سج دھج کے؟" اس نے اس کی تیاری دیکھ کر پوچھا۔

"گول گپے کھانے۔" اس نے فون بیگ میں رکھتے ہوئے عجلت میں جواب دیا۔

"اتنی تیار ہو کر۔" وہ حیران ہوا۔

"نہیں بک سٹور بھی جانا ہے۔"

انس نے اب کی بار اسے ایسے دیکھا جیسے اس کا دماغ خراب ہو گیا ہو۔

"عیسیٰ کے ساتھ جا رہی ہوں۔ کیا اوور لگ رہی ہے میری تیاری؟" اس کی حیرانی بھانپتے ہوئے وہ بولی۔ پھر پریشانی سے پوچھا۔ انس قہقہہ لگاتا ہنس پڑا۔

"کیا شگوفے ہو آپ دونوں یار۔" پھر کہا، اس سے پہلے وہ مزید کچھ کہتا دروازے پر بیل ہوئی۔ انس مسکراتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ دروازہ کھولا تو سیاہ جینز اور سیاہ

شرٹ میں ملبوس سیاہ آنکھوں والا مرد دکھائی دیا۔ عیسیٰ سامنے انس کو دیکھ کر گڑبڑایا۔
''السلام علیکم!'' پھر سلام کیا۔ انس جواب دیتے ہوئے دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔
''آئیں اندر آ جائیں۔''
''نہیں بس السا ءنور کو بلاؤ ہمیں نکلنا ہے۔'' اس نے دانستہ طور پر اندر آنے سے انکار کر دیا۔ انس کی نظریں اس کے ہاتھ پر پڑیں، وہ پیچھے کیا چھپا رہا تھا؟ وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتا السا ء کے کمرے کی طرف بڑھ گیا جو بیل ہوتے ہی اندر چلی گئی تھی۔
چند لمحے بعد وہ دونوں آگے پیچھے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ دروازے کے پاس پہنچ کر انس دروازے میں کھڑا ہو گیا۔
''السا ء! تمہیں کاٹن کینڈی پسند ہے؟'' پھر اس سے پوچھا۔ آنکھوں میں ہنوز شرارت تھی۔ عیسیٰ اس کی بات پر گڑبڑایا۔ کان اور گال دونوں بیک وقت سرخ ہوئے۔
''بالکل نہیں کیوں؟'' پھر پوچھا۔ دانت بھی پیسے یہ کوئی سوال تھا اس وقت کرنے والا۔
''کیونکہ آپ کے میاں آپ کے لیے کاٹن کینڈی لائے ہیں لیکن چونکہ وہ السا ءنور کو تو نہیں پسند لیکن اس کے بھائی انس کو بہت پسند ہے اس لیے اسے میں رکھ لیتا ہوں۔'' انس دروازے سے باہر گیا اور عیسیٰ سے کاٹن کینڈی لیتے ہوئے واپس اندر کی طرف بڑھ گیا۔
السا ء نے پہلے عیسیٰ کو دیکھا پھر انس کو پھر ساری بات سمجھ آ گئی۔
''جائیں اب آپ لوگ۔'' اس نے السا ء کو پھر ہاتھ سے پکڑتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھایا۔ عیسیٰ نے پھر دونوں کو نہ دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ اسے لگا تھا دروازہ السا ء کھولے گی۔ اف یار۔ کان ابھی تک سرخ تھے۔ السا ءنور جیسے ہی باہر آئی انس نے دروازہ بند کر دیا۔ عیسیٰ کی بائیک تھوڑا آگے کھڑی تھی۔ وہ دونوں ساتھ ہو لیے، ابھی عیسیٰ کچھ کہتا اس

نے الساء کو واپس پلٹتے دیکھا۔ وہ تیزی سے گھر کی جانب گئی، دروازے کی بیل بجائی۔ انس نے دروازہ پھر سے کھولا حیرانی سے اسے دیکھا۔

''یہ میرے شوہر میرے لیے لائے ہیں اس لیے اس پر میرا حق ہے۔'' الساء نے اس کے ہاتھ سے کاٹن کینڈی چھینی پھر اس کے بال کھینچے اور یہ جا وہ جا۔ انس ابھی تک بغیر کچھ سمجھے وہیں کھڑا تھا پھر بے اختیار مسکراتا ہوا دروازہ بند کر گیا۔

''خدا تم دونوں کا عالم ارواح تک ساتھ رکھے۔ اور اس کے بعد جنت میں بھی۔'' عیسیٰ نے اسے دیکھا جو مسکراتے ہوئے ہاتھ میں کاٹن کینڈی لیے آ رہی تھی۔

''آپ کو نہیں پسند تو کھانے دیتیں انس کو۔'' عیسیٰ نے بائیک پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ اچھی لگ رہی تھی۔ پیاری بھی۔ کاٹن کینڈی تھامے اپنی بھی لگ رہی تھی۔

''کاٹن کینڈی آج سے میری پسندیدہ چیزوں میں شامل ہے۔'' اس نے جواب دیا اور اس کے پیچھے بائیک پر بیٹھ گئی۔ وہ سیاہ لباس پہنے اچھا لگ رہا تھا۔ اور اس کے لیے کاٹن کینڈی لایا تھا تو مزید اپنا لگا تھا۔ وقت نے ٹھہر کے دونوں کو دیکھا وہ جو سفید اور سیاہ میں ملبوس تھے اور بس ایک دوسرے کے لیے بنے ہوئے لگ رہے تھے۔

(محبت یک طرفہ ہو یا دو طرفہ جو چیز اس میں اہمیت رکھتی ہے وہ ہے محبت کی قدر۔ گل شاد حسین اور غزل میر نے محبت کی قدر نہیں کی لیکن میں نگہت گل شاد حسین اپنی آخری سانسوں تک اس محبت کی قدر کروں گی جو مجھے اپنے شوہر سے ہوئی ہے۔ بس ایک چیز جس کا مجھے سب سے زیادہ افسوس ہے اور رہے گا وہ یہ ہے کہ مجھے میری محبت صرف دنیا کی حدود تک ہی نبھانے کی مہلت ہے۔ کیونکہ عالم ارواح میں گل شاد حسین اور غزل میر ایک دوسرے کو چنیں گے۔ جنت میں ان دونوں کا گھر ہوگا۔ تب کوئی دوسرا تیسرا ان کے درمیان نہ ہوگا۔ انہوں نے اس

دنیا میں بھی ایک دوسرے کو چنا جو فانی تھی وہ اس دنیا میں بھی ایک دوسرے کو منتخب کریں گے جو ابدی ہے۔ نگہت تو گل شاد حسین اور غزل میر کی زندگی کا اضافی کردار ہے۔ میرا کاش اس دنیا کے لیے نہیں ہے لیکن کوئی بات نہیں یہاں بہتر ملا ہے وہاں بہترین ملے گا۔ ہاں وہ گل شاد حسین نہیں ہوگا لیکن کچھ چیزیں انسانوں کے ہاتھ میں نہیں ہوتیں۔)

ایک بجے کی بس میں سوار ہوتے ہوئے گل شاد حسین نے اس دن عرصہ بعد جس جانب رخ کیا تھا وہاں سے جڑی یادیں بری بھی تھیں اور خوشگوار بھی۔ کھڑکی کی طرف بیٹھے شیشے سے سر ٹکائے وہ ایک مرتبہ پھر وہ نظم سن رہا تھا۔ دل میں درد تھا۔

"پھر کوئی آیا دلِ زار، نہیں کوئی نہیں۔"

عرصہ بعد وہ واپس پہاڑوں میں جا رہا تھا جہاں وہ تھی جو اس کے روح کا حصہ تھی اس کی پسلی سے بنی تھی اور اس کے قلب میں پہلے روز کی طرح آج بھی اپنی پوری شان سے براجمان تھی۔ گل شاد حسین کو آج بھی یہ بات سمجھ نہیں آئی تھی کہ ان میں سے محبوب کون ہے عاشق کون؟ ان دونوں کی محبت غیر مشروط تھی۔ وہ دونوں محبت کے ایک ہی زینے پر کھڑے تھے۔ کھڑے رہے تھے۔ اس نے عیسیٰ کو یہ نہیں بتایا کہ مارگلہ کی پہاڑی پر بہانے والے آنسوؤں کے بعد اس نے ہر دن، ہر لمحہ آنسو بہائے تھے۔ آخری وقت میں بھی غزل نے اسے معاف نہیں کیا تھا یہ اذیت کتنی بڑی تھی۔ وہ دونوں اب ساتھ نہیں تھے یہ تکلیف پہاڑ جیسی تھی۔ اس کا دل ہر لمحہ ٹوٹتا ہے نہ جڑنے کے لیے۔ یہ وہ کیسے بتاتا۔ اس نے یہ باتیں کسی کو نہیں بتائیں۔ بتا نہیں پایا۔ اور بتانا چاہتا بھی نہیں تھا۔ کیونکہ کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جو ہم لفظوں کے ذریعے بیان نہیں کر سکتے۔ کر ہی نہیں سکتے۔ وہ بیان ہو بھی نہیں سکتے۔ ان کے آگے الفاظ کا ڈھیر بھی ردی ہے۔ کچھ پچھتاوے ساری زندگی کے ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں۔ زبان سے

ادا نہ ہوں لیکن دل میں ہر پل بستے ہوئے۔
جس وقت چھ بجے مظفر آباد کے اڈے پر بس رکی تو لوگوں کے علم میں یہ بات آئی کہ ایک انسان اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ اور وہ انسان گل شاد حسین تھا۔ ان کی جیب سے ایک کاغذ نکلا جس پر ایک پتہ درج تھا ساتھ نمبر بھی۔ جس پر لوگوں نے ان کے ورثاء کو اطلاع دی۔
پہاڑوں کے بیچ و بیچ اس مٹی اور پتھر کے مکان میں اب کوئی نہیں رہتا تھا۔ آس پاس گھنا جنگل اگ آیا تھا۔ گھر کے پاس ہی دو قبریں ساتھ بنی تھیں۔ دونوں کی تختیوں پر نام درج تھا۔
گل شاد حسین ولد محمد حسین۔ ساتھ تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات۔ غزل میر (گل شاد حسین) ساتھ تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات۔ اس کے باپ کا نام آج بھی ساتھ تھا جیسے اس کی خواہش تھی اس کے شوہر کا نام بھی ساتھ تھا جو اس کا نصیب تھا۔
دونوں قبروں کے اوپر سبز گھاس اُگی ہوئی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ان کی شادی کے بعد پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ جہاں وہ ساتھ بیٹھے چاند کو دیکھ رہے تھے، جہاں لالٹین درمیان میں رکھے وہ دونوں زرد روشنی میں ایک دوسرے کو محسوس کر رہے تھے۔ کشمیر کے پہاڑوں پر گھنے جنگل میں یہ دو قبریں کسی کو یاد نہیں تھیں سوائے ان کے گھر والوں کے۔ وہ دونوں دنیا میں ملے تھے لیکن یہاں وصل سے زیادہ ہجر تھا۔ انہیں اب کسی اور جہاں میں ملنا تھا جہاں بس وصل ہی وصل تھا۔ کہیں جدائی نہ تھی، کہیں فراق نہ تھا۔
(ہم سب کے قلب کبھی بھی مکمل طور پہ صحت یاب نہ ہو سکے۔ نہ ہو سکتے ہیں۔ ہم سب دل زار کو لیے چلتے رہے۔ یہ کتاب میری ضرور ہے، اس میں میرا یعنی نگہت کا بھی کردار ہے پر یہ داستان پہاڑوں میں رہنے والی غزل میر اور خود کو پہاڑوں کے سپرد کرنے والے گل شاد حسین کی ہے۔ اور میں یعنی نگہت گل شاد حسین اپنے محبوب کے لیے دعا کرتی ہوں کہ اسے اللہ اس

کی غزل سے ضرور ملائے اور جو زندگی انہوں نے یہاں جینی تھی وہ وہاں کسی اور کائنات میں کسی اچھے جہاں میں جئیں۔ یک طرفہ محبت ہر بار اذیت نہیں ہوتی، کبھی کبھی یہ مرہم ہوتی ہے ہر اس زخم کی جو دنیا نے دیئے ہوں۔ محبوب کو پتا ہی نہیں ہوتا اور عاشق کے سارے زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔)

جس نے محبت کی جتنی قدر کی وہ اتنی بڑھتی چلی گئی۔ محبت اپنی ناقدری کرنے والوں کو پھر کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ محبت جن پر مہربان ہوتی ہے تو اسے آزمائشوں پر سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ جہاں عاشق یا محبوب کمزور پڑے وہیں محبت ان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔